اقبال اور ہندوستان

ڈاکٹر توقیر احمد خاں

ناشر : نئی کتاب پبلشرز
D-24، ابوالفضل انکلیو پارٹ-1، جامعہ نگر، نئی دہلی-25
فون نمبرز: 65416661, 9313883054

تقسیم کار:
(1) **Ahluwalia Book Depot**
پوسٹ باکس نمبر 2507، نئی دہلی-110005
(2) بک ایمپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-4
(3) انیس کتاب گھر، امیر گنج، ٹونک، (راجستھان)
(4) **Cadplan Publishers & Distributors**
Z-326/3، جامعہ نگر، اوکھلا مین روڈ، نئی دہلی-25
فون نمبر: 9899300556



D-24, Abul Fazal Enclave, Part-I, Jamia Nagar
New Delhi-25 (Ph.)65416661 (Mob.) 9313883054,

باراول: اکتوبر 2007ء
قیمت: -/60روپے

اے۔پی آفسیٹ پریس، کٹرہ دینا بیگ، لال کنواں، دہلی-6، میں طبع ہوئی۔

اُجاڑا ہے تمیزِ ملّت و آئیں نے قوموں کو

مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا؟
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا!
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں!
یہی شہ کار ہے تیرے ہُنر کا

برِ صغیر کے معروف نقاد اور اپنے مشفق و محترم استاد

پروفیسر قمر رئیس

کے

نام

اگر سیاہ دلم، داغِ لالہ رازِ توام
وگر کشادہ جبینم، گلِ بہارِ توام

فہرست

دیباچہ

اگر ہمیں صحیح یاد ہے تو اقبال کی شخصیت اور شاعری پر سب سے پہلے شائع ہونے والی کتاب Poet of The East تھی جس کے مصنف نواب ذوالفقار علی خاں تھے۔ یہ کتاب اقبال کی زندگی میں شائع ہوئی۔ گویا بہ مع اقبال سب نے اس بات کو تسلیم کیا کہ اقبال ایشائی بیداری یا مشرقی بیداری کے شاعر ہیں آج بھی بعض اداروں نے اقبال کی شاعری پر سمینار منعقد کیے جن میں اقبال کو "The Poet of Asia's Awakening" قرار دیا گیا۔ خود اقبال نے اپنے آپ کو اپنے اشعار میں ''شاعرِ مشرق'' کہا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بجا اور درست ہے جس کا عکس اس کتاب کے بعض مضامین میں ملے گا کہ اقبال کو اقوام مشرق سے بہت زیادہ نسبت اور دلچسپی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس گرویدگی کا نقطۂ ارتکاز ہندوستان ہی تھا، جس کی مثالیں اقبال کی شاعری اور نثری تحریروں سے دینے کی ضرورت نہیں۔

اقبال کے متعلق یہ مجموعۂ مضامین ایام گذشتہ میں لکھے گئے مختلف مضامین ہیں جن کو اب مزید نظر ثانی کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ اب تک تمام اقبالیاتی مضامین کو ایک کتاب کی شکل میں منظر عام پر لانے کا ارادہ تھا جن کی ضخامت اچھی خاصی ہو رہی تھی۔ کرم فرمائے من شاہد علی خاں سابق جنرل منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے مشورہ دیا کہ ان کو موضوعات کے حساب سے الگ کر لیا جائے۔ چنانچہ جب ترتیب و ترمیم کی گئی تو صرف اقبال اور حبِ وطنی یا اقبال اور ہندوستان سے متعلق ۸ مضامین نکل آئے جو الگ ایک

کتاب کی صورت اختیار کر سکتے تھے۔ چنانچہ محترم موصوف کے مشورے کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا ہی کیا گیا جس میں طباعت و اشاعت سے متعلق کچھ دوسری سہولتیں بھی نظر آئیں۔

اقبال کی حب الوطنی کے موضوع پر مواد تو بے پناہ ہے اور شاید اقبال کی ہر کتاب میں اس کا کچھ نہ کچھ تذکرہ ضرور مل جائے گا لیکن یہ تذکرہ ضمناً یا اختصاراً کیا گیا ہے۔ صرف اسی موضوع کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی اب تک کوئی بھی قابلِ قدر کتاب نظر نہیں آئی، جس کی وجہ سے یہ موضوع ابھی تک تشنہ ہی رہا ہے۔ گذشتہ دنوں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ایم فل کے لیے ایک موضوع دیا گیا تھا جس کا عنوان ''اقبال کا تصور وطن'' تھا جو ابھی کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا ہے لیکن اس مقابلہ میں خالصتاً اقبال کے وطن دوستانہ خیالات پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

اقبال کے اختیار کردہ فکر و فلسفہ کی طرح ان کی حبّ الوطنی کی ایک ارتقائی صورت نظر آتی ہے۔ اقبال نے ایک دفعہ Culture اور Civilization کا فرق ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ Culture یعنی تہذیب کا تعلق خارجی عوامل سے ہے جبکہ Civilization یعنی ثقافت کا تعلق انسان کے ذہنی تصورات سے ہے۔ اسی طرح ان کی حب الوطنی کے بھی دو رُخ اور دو پہلو نظر آتے ہیں۔ ایک تو وہی جن کا تعلق ظاہری امور سے ہے اور جن کو وطن عزیز کی محبت قرار دیا جا سکتا ہے یعنی وطن کی ظاہری شکل و صورت وہاں کی زمین، مٹی، پہاڑ، دریا، میدان، فضائیں اور انسان اور ان کی حرکات۔ اور دوسری وطن عزیز کی وہ داخلی تصویر جس میں یہاں کے فکر و فلسفہ، شعر و ادب، سیاست اور انقلاب وغیرہ سے محبت اور پیار جھلکتا ہے۔

پیش نظر مضامین میں اقبال کی حب الوطنی یا وطن دوستی کے مذکورہ دونوں رُخ نظر آئیں گے۔ ان مضامین میں کچھ تو ایسے ہیں جو اقبال کی حب الوطنی کے وطن عزیز

سے متعلق نظری یا مرئی یا مادّی اشیاء کا احاطہ کرتے ہیں یعنی ایسے موضوعات جن کا تعلق تہذیب سے ہے اور بعض مضامین ایسے ہیں جو ہندوستانی فکر ونظر کو ظاہر کرتے ہیں یعنی ایسے مضامین جن کا تعلق تمدن سے ہے۔

مضامین کے یکجا ہو جانے کے بعد اب کتاب کے عنوان یعنی کتاب کے نام کی تجویز زیرِغور رہی چنانچہ کئی نام ذہن میں آئے ''محبِ وطن اقبال''، ''اقبال کی حب الوطنی''، ''اقبال کی وطن دوستی''، ''اقبال کے تصورات وطن'' اور ''اقبال کے وطن دوستانہ خیالات'' وغیرہ لیکن ان سب میں ''اقبال اور ہندوستان'' سب سے زیادہ جامع اور موزوں معلوم ہوا جس کی وجہ سے اس کتاب کا نام ''اقبال اور ہندوستان'' ہی رکھ دیا گیا۔ کیونکہ تمام مضامین اقبال کے نظریۂ ہندوستان سے متعلق ہی ہیں اس لیے اس نام نے اطمینان عطا کیا۔ ہم کو معلوم نہیں کہ کتاب کس لائق ثابت ہوگی لیکن کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کے یہاں ہندوستان بحیثیت ملک وقوم اور ہندوستان بحیثیت تہذیب وثقافت جس طرح کا نظر آیا ہے اقبال ہی کے اقوال وافکار کے حوالہ سے پیش کیا جا سکے۔

ہمارا یہ دعویٰ تو نہیں کہ ان مضامین میں اقبال کے متعلق بعض متعصبانہ اعتراضات کا جواب ملے گا لیکن یہ ضرور امید کرتے ہیں کہ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد اس قسم کا نظریہ رکھنے والوں کو شاید ازسرنو غور کرنا ہوگا اور ان کو اپنے تعصب آمیز خیالات پر نظرِ ثانی کرنے پڑے گی۔ اور اگر ایسا ممکن ہوا کہ انھیں اقبال کے سیکولر ذہن کو سمجھنے میں ذرا بھی مدد ملی تو ہماری محنت کامیاب ہوگی، کیونکہ سیکولرزم سے ہم دوسرے مذاہب کو برا بھلا کہنے سے مراد نہیں لیتے بلکہ ہمارے نزدیک سیکولرزم وہ خیال ہے کہ جس میں کسی بھی مذہب کو بُرا بھلا کہنے کی گنجائش نہیں اور وہ غالباً پابند ہے اُس اصول کا جس کے مطابق ہر ایک شخص کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہے یعنی تمھارا مذہب تمھیں مبارک اور میرا مذہب مجھے عزیز ہے۔ اور شاید آزاد ہندوستان کا یہی آئین بھی ہے۔ ان تمام مضامین

میں یہی ایک نقطۂ اتصال نظر آئے گا اور ہم نے اقبال کو اسی نظر سے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں اقبال ہمیں بے حد وسیع المشرب، وسیع الذہن اور روشن دماغ شخص نظر آئے جو انتہائی غیر متعصب ذہن رکھتے تھے۔ انھوں نے دوسروں کے ملک و مذہب دونوں کا احترام کیا۔ کبھی کسی کے ملک اور مذہب کی تحقیر نہیں کی۔ ہاں اپنے مذہب اور ملک کی تعریف ضرور کی جس پر کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہیں ہے۔

میں شکر گذار ہوں جناب شاہد علی خاں صاحب منیجر و مالک نئی کتاب پبلشرز کا، کہ انھیں کی تحریک سے یہ کتاب منظر عام پر آسکی اور شکر گذار ہوں محترمہ شبنم صاحبہ کا کہ انھوں نے بہت ہی کم مدّت میں کمپوزنگ کے مرحلے کو حل کر دیا۔

ڈاکٹر توقیر احمد خاں
ریڈر شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی، دہلی۔۱۱۰۰۰۷

اقبال کا ترانہ ہندی

۱۵/اپریل ۱۹۸۴ء کا دن ہندوستان کا وہ تاریخ ساز دن ہے جب ہندوستان کے سب سے پہلے خلاباز راکیش شرما نے ملک کی وزیراعظم آنجہانی مسز اندرا گاندھی سے خلا میں رہ کر گفتگو کی۔ مسز گاندھی نے مختلف سوالات کے دوران شری راکیش شرما سے پوچھا کہ آپ کو وہاں سے بھارت کیسا لگا؟ تو راکیش شرما نے فوراً ہی جواب دیا کہ میں بلا جھجک کہہ سکتا ہوں ''سارے جہاں سے اچھا...'' یہ وہ دن تھا جب ہندوستان کا سب سے پہلا خلائی مسافر خلاؤں میں مشرق کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال کا کلام پڑھ رہا تھا اور اپنے آپ میں ایک سرور اور فخر محسوس کر رہا تھا۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' اقبال کی وہ نظم ہے جو نہ صرف جنگ آزادی کے زمانے سے ہند کا قومی ترانہ ہے بلکہ اقبال کی یہی وہ نظم ہے جو جنگ آزادی میں دلوں کو گرمانے کے کام بھی آئی۔ اس ترانے کی نغمگی اور ترنم سے ہمارا ذہن، فکرِ اقبال کی آزادی اور قومی یکجہتی کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ علی سردار جعفری نے اپنی کتاب ''اقبال آشنائی'' کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا ہے:

> ''۱۴/اور ۱۵/اگست کی درمیانی رات میں جب ہندوستان کی آزاد مجلسِ قانون ساز میں آزاد ہندوستان کا ترنگا جھنڈا پیش کیا تو مسز سوچیتا کرپلانی نے اقبال کا ترانۂ ہندی گایا۔ اس وقت تک آزاد ہندوستان کے قومی گیت کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اس واقعے کے ۱۷ سال بعد جب ۱۹۶۴ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی راکھ الٰہ آباد میں گنگا جمنا کے سنگم میں ڈالی جارہی تھی تو کسی کو پھر اقبال کا ترانۂ ہندی یاد آگیا اور فضا اس شعر سے گونج اٹھی'' ؎

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو — اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

یہی ''ہندوستان ہمارا'' اقبال کی ان دو نظموں میں سے ہے جس کی بنا پر اقبال کو ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے اور یہی وہ واحد نظم ہے جو زبان زدِ خلاق ہے۔ یہ نظم حبِ وطن کی

بے نظیر مثال ہے اور ہندوستانی تو کیا یوروپی زبانوں میں بھی اس کا ہمسر مشکل سے ملے گا۔ نظم میں افکار عالیہ اور جوش عقیدت کے ساتھ ساتھ اس کی اندرونی لے اور مسحور کن نغمہ نیز زبان کی سادگی اور لفظوں کا آہنگ بھی دلوں کو شکار کرنے والا ہے۔ دنیا پڑھتی اور سر دھنتی ہے۔

گاندھی جی نے اقبال کے انتقال پر ۹/جون ۱۹۳۸ء کو انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ کو پیغام بھیجا جو رسالہ ''جوہر'' ۱۹۳۸ء میں اس طرح شائع ہوا:

بھائی محمد حسین! آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں کیا لکھوں لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم ''ہندوستاں ہمارا'' پڑھی تو میرا دل بھر آیا پارودا جیل میں تو سیکڑوں بار اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی یہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

آپ کا م۔ک۔ گاندھی

''ترانۂ ہندی'' میں کوئی خاص بات ہے جس نے مہاتما گاندھی جیسے رہنمائے قوم کو جیل میں سیکڑوں بار اس نظم کو گانے پر مجبور کر دیا اور آج بھی جس وقت یہ ترانہ گایا جاتا ہے، فضا پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے کہ سننے والوں کے دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ اس ترانے کی تاریخِ تصنیف کے سلسلے میں ڈاکٹر حیدر کاشمیری ۱۷/جنوری ۱۹۸۲ء کے قومی آواز نئی دہلی میں لکھتے ہیں:

''یہ بات قابل ذکر ہے کہ جناب جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی نظم ''ہمارا دیس'' آج کل دہلی کے اقبال نمبر ۵ مطبوعہ ۱۹۷۷ء میں بخطِ اقبال ''ترانۂ ہندی'' کے نام سے بغیر کسی حوالے کے شائع کی ہے۔ نظم کے نیچے اقبال نے اگست ۱۹۰۴ء کی تاریخ بھی ڈالی ہے جس سے آزاد صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال نے یہ نظم اسی تاریخ کو تصنیف کی تھی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔ نظم ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کی تخلیق ۱۰/اگست ۱۹۰۴ء کو ہوئی۔ راقم کو آزاد کے بیان سے اختلاف ہے اور میری رائے میں ''ہمارا دیس'' نظم تاریخ مذکور سے قبل تصنیف کی گئی ہے اور اقبال نے اس تاریخ کو اس پر نظر ثانی کی تھی۔''

مزے کی بات یہ ہے کہ ''مرقع اقبال'' میں اس نظم کو جگن ناتھ آزاد ہی نے بخطِ اقبال شائع کیا، جس کا عنوان ''ہمارا دیس'' لکھا ہے اور نظم کے نیچے اقبال کے دستخط کے ساتھ تاریخ ۱۰/اگست ۱۹۰۴ء پڑی ہوئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ نظم کی تاریخ تصنیف بقول آزاد ۱۰ار اگست ۱۹۰۴ء ہے یا بقول اکبر حیدر کاشمیری تاریخ مذکور سے قبل کی تصنیف ہے اور اقبال نے اس تاریخ کو اس نظم پر نظر ثانی کی ہے۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ اقبال کی یہ تحریر نظر ثانی کے بعد کی ہے تو گویا یہ ''ترانہ'' اقبال نے ۱۰ار اگست ۱۹۰۴ء سے قبل تصنیف کیا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ نظر ثانی کے بعد اقبال نے تحریر پر وہی تاریخ ثبت کردی ہو جو اس کی اصل تاریخ تصنیف ہے۔ یہ مسئلہ نہایت دلچسپ اور پُر کیف ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدر کاشمیری اپنے مضمون ''زمانہ اور اقبال'' میں اس سے قبل لکھ آئے ہیں کہ ''زمانے کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ اس میں اقبال کی شہرۂ آفاق نظم ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں چھپی تھی۔ نظم کا عنوان اقبال نے ''ہمارا دیس'' رکھا تھا۔ بعد میں یہ ''ہمارا دیس'' کے نام سے ہی مخزن لاہور جلد ۵ نمبر ۱ مطبوعہ اکتوبر ۱۹۰۴ء میں اور پھر اس کے بعد جولائی ۱۹۱۲ء میں ''ادیب'' الٰہ آباد میں شائع ہوئی تھی۔ نظم کے مخزن وغیرہ میں شائع ہونے کے شواہد بھی ملتے ہیں۔ اس پر حسرت موہانی نے ایک طوفان بھی کھڑا کیا تھا۔ حسرت موہانی نے جو تنقید کی تھی وہ نظم کے مخزن میں شائع ہونے کے بعد ہی کی تھی۔ رحیم بخش شاہین کے مطابق یہ تحریر حسرت موہانی کے رسالے ''اردوئے معلّٰی'' علی گڑھ کی اشاعت اکتوبر ۱۹۰۴ء کی ہے۔ حسرت موہانی نے نظم پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''اکتوبر (مخزن لاہور) کا پرچہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض درشت زبان اور ناواقف لوگوں نے قطع نظر کر کے جو نکتہ چینی کا جواب سب وشتم سے دینا چاہتے ہیں اہل پنجاب میں جو لوگ منصف مزاج اور صحت زبان کے خواستگار ہیں، وہ اپنی غلطیوں کو چھوڑتے جاتے ہیں اور نکتہ چینیوں کی نکتہ چینیوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر اقبال صاحب نے ایک غزل کے مقطع میں لکھا تھا:

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں   معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا

''دلگداز'' نے اعتراض کیا کہ اس شعر کے آخر میں ہمارا کے بجائے اپنا چاہئے اور اقبال نے اب اس کو بدل کر مخزن میں اس طرح چھپوا دیا۔

اقبال کوئی اپنا محرم نہیں جہاں میں   معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا''

(اوراق گم گذشتہ ص ۴۱۲)

یہاں حسرت موہانی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حسرت موہانی سے قبل

اس نظم پر عبدالحلیم شرر نے ''دلگداز'' میں بھی اعتراض کیا تھا جس کو اقبال نے تسلیم کر کے درست کر دیا اور نظم کے متن میں ترمیم کر دی۔

لیکن راقم کو اکبر حیدر کاشمیری کے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ یہ نظم پہلی مرتبہ زمانہ ستمبر ۱۹۰۴ میں چھپی۔ راقم کے خیال میں یہ نظم پہلی مرتبہ ''اتحاد'' لکھنؤ میں بالکل اپنی خام شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ اتحاد کے نسخے نہ ملنے کی بنا پر صحیح تاریخ کا کچھ پتہ نہیں چل پایا۔ اتحاد میں اس نظم کے شان نزول کی داستان بڑی عجیب اور دلچسپ ہے۔ واقعہ کا ذکر صاحبزادہ ظفر ہاشمی (ساہیوال) نے کشمیر کے مشہور ناول نگار محمد عمر کی زبانی نقل کیا ہے۔ ناول نگار موصوف کے اقبال سے اچھے تعلقات تھے۔ اس مزے کی داستان کو ناول نگار کی زبان میں سننے سے کچھ اور ہی لطف آئے گا۔ مگر اقتباس ذرا طویل ہے۔ لیکن لطف کے ساتھ ساتھ نتیجے سے بھی خالی نہیں۔ محمد عمر لکھتے ہیں:

> ''کون ہے جس نے حضرت علامہ اقبال کی وہ نظم جس کا عنوان ہے ''ہندوستاں ہمارا'' سنی یا پڑھی نہ ہو مگر ہے کوئی شخص جو یہ بتائے کہ یہ ترانہ کس طرح کہا گیا۔ حضرت اقبال پر بیسیوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر یہ کسی نے نہ لکھا کہ یہ نظم کیسے عالمِ وجود میں آئی اور اس پر کیسے کیسے ہنگامے بپا ہوئے۔ جنھیں اس کا علم تھا وہ قوت بیان سے محروم تھے اور جو اسے بتانے کی اہلیت رکھتے تھے ان بچاروں کو اس کا علم نہ تھا کہ یہ کام مجھے ودیعت ہوا اور مجھ ہی کو کرنا پڑا۔ آپ تو اس کو دیکھ کر خوش ہوں گے مگر مجھ سے پوچھیے تو میں کہوں گا کہ کاش یہ ''ترانہ'' نہ لکھا جاتا۔ اگر حضرت علامہ کو لکھنا ہی تھا تو اس وقت نہ لکھتے جس وقت لکھا۔ آپ تو آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہے ہیں مگر اس ترانے کی مہربانی سے جو کچھ مجھ پر گزری وہ میں ہی جانتا ہوں۔ ۱۹۰۴ء کا حادثہ ۱۹۱۳ء تک میرے لیے سوہانِ روح بنا رہا۔ اب سنیے یہ معرکہ اور میری حالت زار پر ہنسیے یا روئیے جو آپ کو پسند ہو۔
>
> لالہ ہردیال جو ہندوستان سے جلاوطن ہو کر کچھ عرصے تک امریکہ میں مقیم رہے اور بعد ازاں برلن میں فوت ہوئے، گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے کی تعلیم لے رہے تھے۔ یہ ہردیال عجیب خصلت کا آدمی تھا اور عجائبات قدرت میں شمار ہوتا تھا۔ اگر کسی اور زمانے میں ہوتا تو کیا عجب کہ رشی یا مُنی ہونے کا

دعوا کرتا۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ جو کچھ بھی ایک نظر پڑھ لیتا تو پھر وہ کبھی نہ بھولتا۔ ہردیال نہ صرف اپنے کالج میں بلکہ دوسرے کالجوں کے طلبہ میں بھی بڑا ہر دل عزیز تھا۔ لاہور میں ۱۹۰۴ء میں صرف ایک کلب وائی ایم سی اے کا تھا۔ ہردیال بھی اس کا ممبر تھا۔ طبعاً وطن دوست اور قوم پرست۔ ایک دن سکریٹری کلب سے کچھ جھڑپ ہوگئی۔ بات نے طول پکڑا اور ہردیال نے ''ینگ مینز انڈین ایسوسی ایشن'' کی داغ بیل ڈال دی۔ تمام کالجوں کے طلبہ ہردیال کے ہمنوا ہوگئے۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب علامہ اقبال گورنمنٹ کالج میں لکچرار تھے۔ ان کی طبع جولانی پر تھی اور ان کی لازوال شاعری کا آغاز ہو رہا تھا۔ ہردیال سے ان کے تعلقات دوستانہ تھے۔ ہردیال نے اپنے کلب کا افتتاحی جلسہ کیا تو حضرت علامہ کو صدارت کے لیے مدعو کیا جو انھوں نے قبول کرلیا۔ تین بجے شام جلسہ کرنے کا فیصلہ ہوا اور چھے بجے شام جلسہ شروع ہوگیا۔ ذرا مدت کا لحاظ رکھیے اور پھر تاریخ کا لحاظ بھی۔ جب یہ جلسہ شروع ہوا تو آپ نے بجائے خطبہ ارشاد فرمانے کے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' پڑھنا شروع کیا۔ حاضرین پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی۔ علامہ ترنم سے پڑھ رہے تھے اور لوگ جھوم رہے تھے۔ مگر ہم جو روزانہ بلاناغہ شام کو حاضر خدمت ہوا کرتے تھے، حیران تھے یہ نظم کب لکھی گئی۔ وہ نظم پڑھتے گئے اور میں پنسل سے کاغذ پر اتارتا چلا گیا۔ میں ان دنوں ایف سی کالج میں پڑھتا تھا۔ اگر یہ قصہ یہیں ختم ہوجاتا تو میری آئندہ کوفت ختم ہوجاتی مگر وفور عقیدت کہیے یا حماقت کہ میں نے اپنے ہوسٹل میں پہنچ کر اس نظم کو صاف کر کے لکھا۔ ان دنوں مولوی عبدالحلیم شرر اپنے رسالے ''اتحاد'' میں ہندو مسلم اتحاد کے گیت الاپ رہے تھے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یہ نظم برائے اشاعت بھیج دی۔ امنگ یہ تھی کہ میرا نام بھی کسی رسالے میں چھپ کر نکلے۔ اس لیے اپنا نام شائع کرنے کی بڑی تاکید کی۔ مولانا شرر نے نظم تو شائع کردی مگر میرا نام نہ لکھا۔ بات آئی گئی ہوگئی اور رسالے کا انتظار ہونے لگا۔ میں نے حضرت علامہ سے ذکر نہ کیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب رسالہ آئے گا تو لے کر ان کی خدمت میں جاؤں گا۔ وہ اپنا

کلام چھپا ہوا دیکھیں گے تو میری خدمت کی داد دیں گے۔ میں رسالے کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ ایک دن میں حسب معمول ان کے مکان پر گیا جواب بھی بھاٹی دروازہ میں زندہ شہادت دینے کو موجود ہے۔ محفل پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور علامہ غصے کا مجسمہ بنے بیٹھے تھے۔ میں نے چپکے چپکے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے تو معلوم ہوا کہ جو نظم کلب کے جلسے میں پڑھی گئی تھی اسے کسی نے رسالہ ''اتحاد'' لکھنؤ میں شائع کرادیا۔ اس میں بہت سی غلطیاں بھیجنے والی کی بدولت وارد ہوگئی ہیں اور ان غلطیوں کو سامنے رکھ کر مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالے اردوئے معلیٰ میں اہل پنجاب کو جی بھر کر جلی کٹی سنائی ہیں۔ اب اس بچارے فریسندہ کو صلوٰتیں سنائی جارہی ہیں۔ کوئی مہذب وغیر مہذب اٹھا نہ رکھی گئی اور مجھے بھی سینہ پر پتھر رکھ کر اس دشنام دہی میں شریک ہونا پڑا۔ فرمایئے میرے دل وجگر پر کیا کیفیت ہوگی۔ اگر یہیں خاتمہ ہوجاتا تو میں یہ سب کچھ پی جاتا مگر علامہ بضد ہوئے کہ اس شخص کا کھوج لگایا جائے جس نے ایسی حرکت کی ہے۔ اس لیے میں نے بھی بڑے زور سے تائید کی۔ اور اسی روز سے اپنے چہرے کے رنگ کو اڑانے سے روکا۔

اسلامیہ کالج کے ایک قل آعوذ یے نے کہا کہ وہ شخص یوں تو ملنے کا نہیں، مولانا شرر ہی سے پوچھا جائے کہ یہ نظم انھیں کس نے ارسال کی تھی۔ سب نے اس تجویز کی تائید کی۔ میں بظاہر تو اس تجویز کی تائید کررہا تھا مگر باطن میں تجویز کنندہ کو بددعائیں دے رہا تھا۔

اس زمانے میں گورنمنٹ اور ایف سی کالج کے طلبا ارسٹو کریٹ (Aristocrat) اسلامیہ کالج کے قل آعوذیے اور ڈے اے وی کالج کے طلبا ''مدرویشی'' کہلاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ نے جھٹ مولانا شرر کو خط لکھ مارا۔ چونکہ ڈاک خانہ میرے کالج سے قریب تھا اس لیے یہ خط ڈاک میں پوسٹ کرنے کی سعادت میرے سپرد ہوئی۔ میرے وارنٹ اور میرے ہی ہاتھوں اس کی تعمیل۔ سبحان اللہ، قدرت کے کھیل۔ میں بھاٹی دروازہ سے چلا اور نیلا گنبد پہنچنے تک میں نے کئی ایک فرار کی صورتیں پیدا کیں اور مٹادیں۔ یہ خیال کہ شیخ صاحب کا خط ہی غتر بود کردیا جائے۔ آسان تو تھا مگر اس میں آخر پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ پھر یہ

سوچا کہ اس لفافے کی پشت پر لکھ دوں کہ جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ تجویز بھی نا معقول معلوم ہوئی۔ ایک لڑکا اپنے گھر جس کا نہ کوئی مونس نہ غمگسار، نہ کوئی رہبر، نہ مشیر کار، اس حیرانی کی کسک کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھیں اپنے گھروں سے دور ہوسٹلوں میں رہنا پڑتا ہے۔ پھر طبیعت اس بات پر ٹھہری کہ مولانا شرر کو علاحدہ خط لکھا جائے کہ میرا نام نہ بتائیں۔ چنانچہ میں ہوسٹل میں گیا۔ خط لکھا اور دونوں خطوط ڈاک کے حوالے کر دیے۔ مجھے خطوط کی جنگ میں فتح وظفر کی امید کم تھی کہ کہاں کالج کا ایک پروفیسر اور کہاں فرسٹ ائیر کا ایک ادنیٰ طالب علم۔ دو چار دن بڑی پریشانی میں بسر ہوئے۔ خدا مولانا شرر کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، انھوں نے شیخ صاحب کے خط کا جواب دیا اور لکھا کہ کسی نے لاہور سے یہ نظم بھیجی تھی۔ مسودہ بہت تلاش کیا نہ ملا۔ نام یاد نہیں۔

میں تو اس عذاب سے چھوٹا مگر اور لوگ پھنس گئے۔ مولانا حسرت موہانی کی اس تعریض نے یوپی اور پنجاب کے ادیبوں میں ایک طویل بحث کا دروازہ کھول دیا۔ اردوئے معلیٰ اور مخزن میں محاذ قائم ہوئے خوب گولہ باری ہوئی۔ گھمسان کے معرکے پڑے۔ آخر چھے سات مہینوں کے بعد فریقین تھک کر چور ہو گئے۔ نہ کوئی جیتا نہ کوئی ہارا۔ یہ راز مدتوں سربستہ رہا۔ شیخ صاحب تعلیم کے لیے ولایت چلے گئے۔ واپس آئے اور میں سمجھا کہ نظم والی بات ان کے ذہن سے اتر گئی ہوگی۔ جب آپ ۱۹۱۳ء میں سری نگر تشریف لائے اور مولوی احمد دین، منشی نور الٰہی اور ان کے دو ایک موکل اور راقم الحروف ان کے پاس ہاؤس بوٹ میں بیٹھے تھے کہ ایک ''شکارا'' ہمارے پاس سے گزرا۔ اس میں دو تین بچے یہی نظم گا رہے تھے۔ اس غیر شعوری استقبال نے ایک کیفیت پیدا کر دی جس کے سرور میں حضرت علامہ نے بھی حصہ لیا اور بیان کیا کہ کس طرح یہ نظم شائع ہوئی اور کس طرح ایک ادبی طوفان بپا ہوا مگر یہ پتا نہ چلا کہ نظم کس نے شائع کرائی۔ منشی نور الٰہی نے میری طرف دیکھا اور میں کچھ کھو سا گیا مگر ظالم نے بتا ہی دیا کہ یہ کارستانی میری تھی۔ سب ہنس پڑے اور حضرت علامہ بھی اس میں شریک غالب تھے۔ جی ہاں یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔'' (اوراق گم گشتہ ص ۳۱۷)

معلوم یہ ہوا کہ اقبال کے اس ترانے کی اصل تاریخِ تصنیف وہ دن ہے جس دن اقبال نے لالہ ہردیال کے یہاں اس کو پڑھ کر سنایا۔ یہ وہی لالہ ہردیال ہیں جن کے نام پر دلّی کی ہارڈنگ لائبریری کا نام ہردیال لائبریری رکھ دیا گیا۔ جب تک اس دن کی صحیح تاریخ کا پتہ نہ چل جائے کہ لالہ ہردیال کے کلب کا افتتاحی جلسہ کون سے دن تھا؟ ''ترانۂ ہندی'' کی تاریخ تصنیف کا تعین نہیں کیا سکتا اور اس کے اولین عنوان کے بارے میں کہہ دینا بھی قیاس ہوگا۔ جب تک ''اتحاد'' کا وہ پرچہ نہ مل جائے جس میں یہ نظم شائع ہوئی تھی۔

۱۹۰۴ء میں اقبال نے جب یہ نظم کہی تو ملک کے گوشے گوشے سے دادِ تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں اور اقبال کو وطن دوستی اور ہند پروری کے بامِ عروج پر بٹھا دیا گیا۔ جہاں تک وطن دوستی کا تعلق ہے، کسی ملک کے بارے میں اس سے بڑھ کر اور کیا بات کہی جا سکتی ہے اور وہ بھی اتنے سادہ اور پرسوز الفاظ میں: ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔'' یہاں لفظ ''ہندی'' خصوصاً مدنظر ہے۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ گئے۔ وہاں سے اعلیٰ تعلیم کے بعد لوٹے اور ان کی آنکھوں نے جنگ بلقان اور جنگ طرابلس میں تباہی کے وہ منظر دیکھے جن میں مسلمانوں پر بدترین مظالم ڈھائے گئے۔ ان کے خون کو پانی سے زیادہ ارزاں سمجھ کر اس ارض پاک پر گندے نالوں کی طرح بہا دیا گیا۔ یورپی اقوام کی یہ ستم گری جس نے مسلمان کو خاک وخون میں لتھیڑ دیا اقبال سے برداشت نہ ہو سکی اور انھوں نے عالم انسانیت کی اس خوں ریزی کا سبب وطنیت کو قرار دیا۔ چنانچہ اس زمانے میں اقبال نے بہت سی قومی نظمیں شمع و شاعر، مسلم، حضور رسالت مآبؐ میں، خضر راہ، شکوہ اور جواب شکوہ وغیرہ لکھیں جن میں ملّی درد بے جا کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ اسی اثناء یعنی ۱۹۱۱ء میں اقبال نے ملّی جذبات سے سرشار ہو کر ایک اور قیامت خیز نظم ترانہ 'ملّی' تحریر کی۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا   ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

تو ایک مخصوص حلقہ میں بے چینی بڑھی اضطراب پیدا ہو گیا جیسے اقبال نے اپنی نظم ترانہ ہندی کی تردید کردی اور اس کے بالمقابل دوسرا ترانہ لکھ ڈالا جس کا عنوان بھی ''ترانہ ہندی'' کے بجائے ''ترانہ ملّی'' رکھا۔ سیاسی، شعری حلقوں میں بھی کھلبلی مچ گئی۔ جواباً مصرعے کہے گئے ''رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا''۔ بقول فراق گورکھپوری اکبر الہ آبادی نے بھی اس پر کھٹکتا ہوا مصرع کہا ''کچھ بھی نہیں ہمارا، وہم و گماں ہمارا''

گویا لوگوں نے اقبال کے اس 'ترانہ ملی' کو اقبال کے 'ترانہ ہندی' سے متضاد سمجھا اور یوں میزانِ تنقید پر رکھا۔

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

لوگ سمجھے کہ اقبال نے پہلے ہندی ہیں ہم کہا اور وطن ہندوستاں اور پھر مسلم ہیں ہم کہا اور پھر وطن سارا جہاں تو دونوں خیالات کی تردید ہوگئی۔ جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ غور کیجیے اقبال نے پہلے ہندی ہیں ہم کہا لیکن کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ ہم ہندی نہیں ہیں۔ انھوں نے اگر مسلم ہیں ہم کہہ دیا تو اس سے ان کے ہندی ہونے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہندی مسلم بھی تو ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ خود ضرب کلیم کی ایک نظم کا عنوان ''ہندی مسلمان'' ہے۔ اور اس کے ساتھ ملاحظہ ہو 'وطن ہے ہندوستاں ہمارا' کے بعد 'وطن ہے سارا جہاں ہمارا' تو اس دوسرے قول سے پہلے قول کی قطعی نفی نہیں ہوتی۔ سارا جہاں اگر وطن مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہندوستان وطن نہیں۔ ہندوستان بھی تو سارے جہاں میں شامل ہے اور سارا جہاں اگر وطن ہوگا تو ہندوستان تو اپنے آپ ہی وطن بن جائے گا۔ اس طرح گویا اقبال نے نہ ہندی ہونے سے انکار کیا اور نہ ہندوستان کے اپنے وطن ہونے سے بلکہ یوں کہیے کہ تصورات میں اور وسعت پیدا ہوگئی۔ اس طرح اس میں زمان و مکان کی حدیں ٹوٹ کر وسیع و بیکراں ہوگیں۔ پھر ایک نئ اصطلاح ہندی مسلمان کا ظہور ہوا۔ وطن ہندوستان سے پھیل کر سارا جہاں ہوگیا اور قومیت ہندی سے بڑھ کر مسلمان ہوگئی۔ دونوں تصورات میں ایک جامع وسعت اور پھیلاؤ پیدا ہوا جس کے سبب دوسری نظم کی حدیں آفاقی ہوگئیں۔ اسی کا اشارہ اقبال نے شاید اپنی نظم طلوع اسلام میں بھی کیا تھا۔

یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

لفظ 'ہندی' تو اقبال کو پہلے ہی سے مرغوب تھا۔ اقبال نے جس طرح اولین دور میں ہمالہ اور تصویر درد وغیرہ نظمیں لکھیں، اسی طرح اواخر عمر ۱۹۳۸ء میں بھی اس لفظ کو اسی ذوق و شوق کے ساتھ پیش کرتے رہے اور بتاتے رہے کہ مجھے اپنے ہندی ہونے پر فخر ہے۔ میں ہندی ہوں اور ہندی رہوں گا۔ بال جبریل کی ایک نظم 'مسجدِ قرطبہ' (۱۹۳۳ء) میں بھی ہندی کے لفظ کو اسی جذبہ اور اسی ولولہ کے ساتھ باندھا جیسا کہ ۱۹۰۴ء میں۔ مسجدِ قرطبہ کے ایک بند کے ٹیپ کا شعر ملاحظہ ہو ۔

کافرِ ہندی ہوں دیکھ میرا ذوق و شوق — دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود

اگر اقبال ہندی نژاد ہونے پر معترض ہوتے تو یہاں ہندی کا لفظ کیوں استعمال کرتے؟ غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف لفظ ہندی استعمال کیا بلکہ اس کے ساتھ ایک اور قیامت خیز لفظ 'کافر' کا اضافہ بھی کر دیا۔ گویا وہ ہندی النسل ہونے پر نازاں ہیں۔ جس سے ہندی لفظ کی معنویت پہلے سے متعدد گنا زیادہ ہوگئی ہے۔

بال جبریل میں اپنی ایک نظم ''پیرومُرید'' میں اقبال نے کچھ ایسے سوالات اٹھائے ہیں جن کا جواب مسلم فقہ اور مذہبی نکات کے ذریعے دینا ممکن تھا۔ ان سوالات کے جوابوں کے لیے اقبال نے مولانا روم کو منتخب کیا ہے۔ مولانا روم کی زبانی سوالوں کے جوابات دیے جاتے ہیں اور سوالات کرنے والا کون ہے؟ یہ غور فرمالیجیے۔ سوالات کرنے والا ایک شخص ''مرید ہندی'' ہے اور وہ اقبال خود ہیں۔ یہاں بھی نوٹ کر لینے کی بات یہ ہے کہ لفظ ہندی اسی طرح عزت اور احترام کے ساتھ استعمال ہوتا رہا ہے جیسا کہ ۱۹۰۴ء میں ''ہندی ہیں ہم وطن ہے'' میں۔

بال جبریل کی رباعیات کے حصّے میں ایک رباعی درج ہے ؎

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی نفس ہندی مقام نغمہ تازی
نگہ آلودۂ انداز افرنگ طبیعت غزنوی قسمت ایازی

اصطلاح موسیقی میں نفس آواز ہے گویا جو کچھ اقبال کہہ رہا ہے وہ ہندی ذریعۂ اظہار کے ذریعے کہا جا رہا ہے اور نفس کے لغوی معنی سانس کے ہیں۔ گویا میں جو سانس لے رہا ہوں وہ ہندی فضا کی پرورش ہے اور ہندی صفات سے لبریز ہے۔ غور کیجیے اس اندازِ تکلم پر اور عش عش کیجیے اس سخن ساز ترنم پر۔ سانس جس کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے ہندی ہے گویا زندگی میں ملنے والی اس قیمتی شے کا تعلق ہند سے ہے۔ یہ ہے اقبال کی ہند پروری کا جذبہ جو غالباً ترانہ ہندی کے افکار سے بھی کوسوں دور آگے بڑھ گیا ہے۔ یعنی جس کی شرکت کے بغیر اقبال کی زندگانی کا تصور ممکن نہیں۔ وہ ایسی شے ہے جو اقبال کی حیات کا جزو لاینفک ہے۔ جو غالباً اقبال کی ''فغان نیم شبی'' اور ''نوائے راز'' کی شکل میں ہمارے سامنے جلوہ فگن ہے۔ اس نوائے پریشاں کو اقبال نے حرز جان بنایا اور اسی مسحور کن نغمہ کا رابطہ صرف اور صرف ہند سے قائم کیا اور اسی کو ''نغمہ ہندی'' کی شکل میں قوم کی پرنم آنکھوں اور ڈوبتے دھڑکتے دلوں کے سامنے پیش کیا۔ ۱۹۱۱ء کی شہرہ آفاق نظم ''شکوہ'' میں سارے شکوے شکایات بیان کرنے کے بعد آخر میں یوں خطاب فرمایا ؎

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری   نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

نغمہ ہندی اگر چہ حجازی لے سے فروتر ہے مگر اقبال کے رگ وریشہ میں پیوست ہے۔ ان کے خون کی بوند بوند میں رچ بس گیا ہے اس لیے اس بلبل تنہا کی نوا سے جو نغمۂ دل سوز پیدا ہوا وہ ہندی تھا، جس نے نہ صرف ہندیوں بلکہ غیر ہندیوں کے دلوں کو بھی چاک کر ڈالا۔ اگر چہ اقبال نے اپنے معرکتہ الآرا نظریہ خودی ۱۹۱۴ء کا اظہار فارسی زبان کے واسطے سے کیا جس پر مشرق و مغرب میں چاروں طرف ادبی طوفان برپا ہو گیا۔ ہندوستان میں خواجہ حسن نظامی نے اسے تصوف کا مسئلہ بنایا۔ انگلستان میں اینتھم وغیرہ نے اقبال کے اس فلسفے کو جرمن مفکر و فلسفی نطشے کے زیر اثر ثابت کرنے کی کوشش کی اور اقبال کے انسان کامل کو نطشہ کا فوق البشر بتایا۔ اسرار خودی کی یہ زبان فارسی تھی جسے اقبال نے ایسے معنی خیز مفاہیم کے لیے منتخب کیا تھا لیکن پھر بھی انھیں اس پر مہارت تامہ کا اعتراف نہیں تھا، بلکہ ناز تھا کہ میں ہندی ہوں یعنی سرزمین ہند سے متعلق ہوں جس کی زبان فارسی نہیں کچھ اور ہے۔

ہندیم از پارسی بیگانہ ام   ماہ نو باشم تہی پیمانہ ام

زندگی کے آخری ایام میں بھی اقبال نے اسی طرح لفظ ہندی کو کلیجے سے لگائے رکھا جس طرح ابتدا اور وسط شعر گوئی میں اقبال کی اواخر عمر کی دو کتابیں ہیں ''ضرب کلیم'' جو اسی سال شائع ہوئی تھی جس سال اقبال اس دار فانی سے کوچ کر گئے تھے اور دوسری ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' ہے جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ایک نظم کا عنوان ''اشکے چند بر افتراق ہندیاں'' ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے جس طرح ۱۹۰۴ء میں ہندوستان پر اشک فشانی کی ہے، اسی طرح آخری عمر تک بھی ہندوستانیوں پر اشک بہاتے چلے گئے۔ اس نظم میں فرماتے ہیں کہ ہندوستانی فراست و محبت سے محروم ہیں اور آپسی افتراق نے ان کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اس حالت میں مبتلا کر دیا ہے کہ ہم غیروں کے غلام بن کر رہ گئے ہیں اور دوسروں کے سہارے کی زندگی کوئی خواب گراں نہیں بلکہ دائمی موت ہے اور اس کا غم آسماں سے نہیں بلکہ جان کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے۔ اس آپسی انتشار کے شکار کو نہ غسّال کی ضرورت ہے اور نہ کفن و گور کی، نہ دوست واحباب کے جمع ہو کر غم کرنے کی اور جس شخص کا جامہ اس غم میں چاک نہیں اس کا دوزخ آسمان میں نہیں بلکہ یہ زمین ہی اس کے لیے دوزخ ہے۔ اس کو قیامت کا وقت میدانِ حشر میں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کا کل آج

کے دن میں پوشیدہ ہے۔ ایسا شخص جو دانہ یہاں بوتا ہے، اس کو فصل یہیں کاٹنی ہے اور حق تعالیٰ کے سامنے ایسے بندے کو لے جانے سے کوئی فائدہ نہیں جو آرزو کے ڈنک کی لذت سے آشنا نہ ہو۔ اس کا نقش اس زمین کی فطرت سے صاف ہو جاتا ہے۔ تخت و تاج کا امتیاز آرزو کی فراست اور محبت کی ساحری سے ہے۔ اب وہ دور ختم ہو گیا کہ جب کافری کفر سے اور دین داری دین سے کہلاتی تھی۔ ہندی (ہندوستانی) ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اور کہنہ فتنہ کو انھوں نے دوبارہ اٹھایا ہے۔ یہاں تک کہ فرنگی قوم جو مغرب کی زمین سے ہے ہندیوں کو آپس میں لڑوا کر ثالثی کے فرائض بھی انجام دیتی ہے۔ شاید کسی کو خبر نہیں کہ یہ جلوہ جو آب کی شکل میں دکھایا جا رہا ہے، سراسر دھوکہ ہے۔ اور شاباش خوشا رحمت کہ انقلاب برپا ہو۔ انقلاب ہو۔ انقلاب ہو اور آخر میں کہیے کہ ہر لحظہ زمانہ و روزگار سے جنگ کرو اور سنگ راہ کو اس کی حضوری سے چور چور کر دو۔ اے نوجوانو غلامی میں پیدا ہونے والو۔ آزادی میں مرو۔

ضرب کلیم میں ہندی مسلمان، ہندی اسلام اور ہندی مکتب وغیرہ عنوانات کے تحت نظمیں لکھی ہیں جو اقبال کی ہندی پسندی کی داد کی طالب ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال اپنی عمر کے آخری سانس لے رہے ہیں اور اس دار فانی سے رخصت ہونے والے ہیں۔ لیکن ہند کے لاثانی سپوت کو ہندی بیانی کی فکر ہے اور اسی لیے بار بار مختلف افکار کے ساتھ ہندی ہندی کا لاحقہ و سابقہ لگا کر افکار کا رُخ ہندی فضا کی جانب موڑ دیا ہے۔ اس نے ہند کی تاریک فضا کو منوّر کرنے اور مردان گراں خواب کو خواب سے بیدار کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور اپنے اشکوں سے اس نمناک مٹی کو سیراب کر کے زرخیز بنایا ہے۔

جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو

اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز

۲۰۰۴ء میں اقبال کے اس ترانۂ ہندی کو پورے سو سال ہو چکے ہیں۔ ممبئی، بھوپال اور حیدرآباد میں اس ترانہ کے صد سالہ جشن پر تقریبات منعقد کی جا چکی ہیں اور اس ترانے کی عصری معنویت اور اہمیت پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ترانہ کی تازگی اتنی ہی تازہ و شیریں ہے جتنی کہ اب سے سو سال قبل تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کی لطافت اور کشش سو سال قبل سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

☆☆☆

اقبال کی ابتدائی شاعری میں مذہبی رواداری

اگر اقبال کی شخصیت اور شاعری پر اس زاویہ سے نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اقبال شروع ہی سے قومی یگانگت، آپسی بھائی چارہ اور مذہبی رواداری کے قائل تھے۔ رواداشتن کے لغوی معنی جائز رکھنے کے ہیں تو گویا مذہبی رواداری کا مطلب ہوا کہ اپنی تحریروں میں مذہبی باتوں کو جائز قرار دینا اور ہر مذہب کا احترام کرنا۔ ہندوستان میں دو ہی قومیں اکثریت میں ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔ اس کے علاوہ کچھ دیگر قلیل اقوام بھی ہیں۔ اقبال کے حلقہ احباب میں بچپن ہی سے دونوں خیالات کے ماننے والے شامل تھے اور بعد کو یہ حلقہ عیسائی اور دیگر اقوام تک پھیلتا چلا گیا۔ شروع شروع میں اقبال نے جو شاعری کی اس کا خاص موضوع اتحاد تھا اور وہ ہندوستان میں آپسی میل ملاپ اور اخوت کے خواہاں تھے اس لیے تمام مذاہب کے قدر دان تھے اور قومی اتفاق کی بات کرتے تھے۔ ان کے زمانۂ طالب علمی کی شاعری میں بھی اتفاق واتحاد کی شفاف تصویریں ملتی ہیں۔ اس زمانے کی یادگار بعض رباعیوں میں جو کشمیری کانفرنس کے اجلاسوں میں پڑھی گئیں سب سے پہلی رباعی حسب ذیل ہے ؂

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر چشم اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

یہ تو ظاہر ہے مذہبی ہم آہنگی اور رواداری کے اختیار کرنے سے وقار بلند ہوگا لہٰذا اقبال اس وقار کی خاطر مل جل کر رہنے کی تدبیریں بتاتے ہیں۔ اقبال کی نظروں میں کوئی مذہب بُرا نہیں ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اسی بات پر زور دیا اور کبھی بھی کسی مذہب کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ مگر اچھائی کے راستے پر چلنے کے خواہش مند رہے اور بُرے راستے سے بچنے کی دعائیں مانگتے رہے۔ اپنی ابتدائی زمانے کی مشہور نظم ''بچے کی دعا'' میں بغیر کسی دین یا مذہب کا نام لیے انھوں نے بدی سے بچنے اور نیکی کی طرف گامزن رہنے کی تمنا ظاہر کی ہے اور خدا سے دعا مانگی ہے کہ انھیں اس راستے پر چلانا جو نیک ہو، اچھا ہو اور اچھائی کی طرف

لے جانے والا ہو۔

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پر چلانا مجھ کو

۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۰۴ء تک کے زمانے میں اقبال نے بہت سے رسالوں اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں کے لیے جو نظمیں لکھیں ان میں زیادہ تر نظمیں دوسری زبانوں سے ترجمہ کی ہوئی تھیں۔ یہ اردو دنیا میں ایک نیا تجربہ تھا اور انگریزی زبان کی پیروی میں نظم گوئی کا آغاز بھی، جس کے لیے اردو کے سامنے پہلے سے کوئی نمونہ نہ تھا۔ اقبال نے جہاں انگریزی نظموں کو پیش نظر رکھا، وہیں پر انھوں نے ہندو ویدانت اور دوسری مقدس کتابوں کے بعض حصوں کو بھی ترجمہ کے لیے منتخب کیا۔ اگرچہ انگریزوں یا عیسائیوں کے کلام کو اردو جامہ پہنانا بھی مذہبی رواداری کے مذکورہ مفہوم سے خارج نہیں لیکن اقبال نے ہندوستان اور اس کے باشندوں کے پیش نظر خاص طور پر ہندو فلسفہ اور فکر کی جانب توجہ دی۔ سنسکرت زبان سیکھی اور اپنی شاعری کے لیے استفادے کی نئی صورت پیدا کی۔ یہ اقبال کی مذہبی رواداری کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے وید مقدس کی ایک مشہور دعا ''گایتری منتر'' کا منظوم اردو ترجمہ کیا جو آفتاب کے نام سے بانگ درا میں موجود ہے۔ ویسے تو مذہبی رواداری کی نظر سے ترجمہ کرنا ہی کچھ کم قابل تعریف نہیں لیکن اقبال نے اس نظم کے ساتھ جو شذرہ تمہیدی لکھا اس میں اس منتر اور سنسکرت زبان کی جو تعریف و توصیف بیان کی ہے اور اس کو اسلامی عقائد اور فقہ و قرآن سے جس طرح ہم آہنگ و ہم خیال ظاہر کیا ہے وہ اقبال کی تعمقِ نظر اور بین المذاہب مطالعہ کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال مذہبی رواداری کے کس حد تک روادار تھے۔ ہم یہاں نظم آفتاب کے اس شذرۂ تمہیدی کو اس لیے ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں کہ اس سے اقبال کی مذہبی رواداری کو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اس عہد میں ہندو مسلم اتحاد کا اقبال سے سے بڑھ کر کوئی دوسرا شخص علم بردار نہ تھا بلکہ اقبال اس یگانگت کی بنیاد ڈال رہے تھے جو آگے چل کر ایک قومی نظریہ کی شکل میں سامنے آئی اور جس کے سیاسی تصور کی بنیاد پر ملکوں کے فیصلے صادر ہوئے۔ اس شذرۂ تمہیدی کا ایک ایک لفظ اتنا قیمتی اور معنی خیز ہے کہ اس سے انتخاب کرنا دیانتداری کے خلاف ہوگا۔ اس لیے ہم یہاں اس دیباچہ کو من و عن نقل کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

''ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری کہتے ہیں۔ یہ دعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا ان تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظام عالم کے حیرت ناک مظاہر کے مشاہدے سے اوّل اوّل انسان ضعیف انسان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔ اس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علم مِلل ونحل کے عالموں کے لیے انتہا درجہ کا ضروری ہے کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کی (کے) ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ محققین السنۂ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں، ان کو معلوم ہے سرولیم جونس مرحوم کو اسُ دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس مقام پر یہ ظاہر کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ ''سوتر'' استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے لیکن اصل میں اس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادّی آفتاب کسبِ ضیاء کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔

قرآن شریف میں آیا ہے اللہ نور السمٰوات والارض اور محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں ''اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔'' علیٰ ہٰذا القیاس افلاطون الٰہی کے مصری پیرووں اور ایران کے قدیم انبیاء کا بھی یہی مذہب تھا۔ ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں دقّت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ اصل الفاظ کی موسیقیت اور طمانیت آمیز اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اردو زبان میں منتقل نہیں ہوسکتا۔ ''گایتری'' کے مصنف نے ملک الشعرا ٹینی سن کی طرح اپنے اشعار

میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن میں حروف علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہوجاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمے کی بنیاد اسی سوکت (گفتار زیبا) پر رکھی ہے جس کو سوریا نارائن اُپنشد میں گایتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے۔ ترجمہ کرنے کو تو میں نے کردیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قائم کریں گے جو چیپ مین نے پوپ کا ترجمہ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گایتری نہیں ہے۔ محمد اقبال۔" (باقیاتِ اقبال، ص ۱۴۱۔۴۰)

اسی زمانے کی ایک اور نظم "صدائے درد" کے عنوان سے ملتی ہے۔ اس نظم میں اقبال اعلیٰ تعلیم کے خواب دیکھ رہے ہیں اور ہندوستان سے باہر جاکر تعلیمی مدارج طے کرنا چاہتے ہیں۔ نظم کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے خیالوں میں یوروپ کا سفر شروع کردیا ہے اور ہندوستان کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ ایسے وقت میں انھیں ہندوستان کی ایک ایک چیز یاد آرہی ہے یہاں کی تہذیب وتمدن کے امین تمام مذہبی رہنما یاد آرہے ہیں اور وہ ان میں سے ہر ایک کا نام لے کر اسے الوداع کہتے ہیں۔

الوداع اے سیرگاہ شیخ شیراز الوداع
اے دیار بالمیکِ نکتہ پرداز الوداع
الوداع اے مدفن ہجویری اعجاز دم
رخصت اے آرام گاہِ شنکر جادو رقم

الوداع اے سرزمین نانک شیریں بیاں
رخصت اے آرام گاہِ چشتی عیسیٰ بیاں

اس نظم کے باقی اشعار میں اقبال ایسے پیام بر نظر آتے ہیں مانو وہ ہر دل کو الفت کا سبق پڑھا دینا چاہتے ہیں۔ امتیاز قوم وملت سے ان کا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ جب قومی انتشار درد بن کر ان کے دل میں اٹھتا ہے۔ ان کے دل کی یہ تڑپ ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

رمز الفت سے مرے اہلِ وطن غافل ہوئے کار زار عرصۂ ہستی کے ناقابل ہوئے
اپنی اصلیت سے ناواقف ہیں کیا انسان ہیں غیر اپنوں کو سمجھتے ہیں عجب نادان ہیں

جس کا اک مدّت سے دھڑ کا تھا وہ دن آنے کو ہے
صفحۂ ہستی سے اپنا نام مٹ جانے کو ہے
دل حزیں ہے جاں رہین رنج بے اندازہ ہے
آہ اک دفتر ہے اپنا وہ بھی بے شیرازہ ہے
امتیاز قوم و ملت پر مٹے جاتے ہیں یہ
اور اسی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھاتے ہیں یہ
ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی
کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
روح کا جو بن نکھرتا ہے اسی تدبیر سے
آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے
رنگِ قومیّت مگر اس سے بدل سکتا نہیں
خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں
اصل محبوب ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی
اک بیاض نظم ہستی کی ہیں تصویریں سبھی
ایک ہی شے ہے اگر ہر چشمِ دل مخمور ہے
یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے

اُس زمانے میں اقبال نے ہندو مسلم اتحاد کے انداز کی کئی نظمیں لکھیں جن میں ''تصویرِ درد''، ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' اور ''ترانۂ ہندی'' نکتہ عروج کو پہنچی ہوئی ہیں۔ ''تصویرِ درد'' میں اقبال جس بات سے بہت زیادہ مغموم ہیں، وہ فرقہ آرائی اور آپسی انتشار ہے۔ اقبال نے اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کی مانو قسم کھا رکھی ہے۔

پرونا ایک ہی تسبیح میں ہے ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑ دوں گا

ہر بار یہی یاد دلاتے ہیں اور اہل وطن کو آپسی میل جول کی تلقین کرتے ہیں اور خود بھی روتے ہیں اور اوروں کو بھی رلاتے ہیں۔

نہ سمجھو گے مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

''ترانۂ ہندی'' میں اقبال نے مذہبی عداوت، بغض اور تعصب وغیرہ سب کا قلع قمع کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ محبت اور یگانگت میں مذہب کہیں بھی آڑے نہیں آتا ہے۔ چنانچہ ان کا شعر آج تک مثال بنا ہوا ہے اور زبان زد خلائق ہے۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس طرح کی مذہبی رواداری کی بے مثال کوشش اقبال کی نظم ''نیا شوالہ'' میں بھی نظر

آتی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے شیخ و برہمن دونوں کو سمجھایا اور محبت و اخوت کا ایک اور ہی شوالہ تعمیر کرنے کی تجویز پیش کی جس کے سایہ میں ملک کے باشندے بے خوف وحراس نئی، پُر لطف اور مسرت آمیز زندگی بسر کر سکیں۔ کیونکہ آپسی عناد وفساد ہی قوم وملت کی تباہی کا باعث ہے اس لیے اس کا واحد علاج محبت و یگانگت ہے۔ اس دیو استبداد کو پچھاڑنے اور قوم وملت کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ محبت کا پیغام سنایا جائے اور سب مذاہب کے ماننے والوں کو اتحاد و اتفاق پر راضی کیا جائے۔ اسی میں سب کی بھلائی اور سبھی کی بقا مضمر ہے۔ ''نیا شوالہ'' کا ابتدائی حصہ ''حب الوطنی'' ور آخری حصہ مذہبی رواداری کا مظہر ہے۔ نظم کا آخری حصہ ملاحظہ کریں ؎

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں ‏ ‏ بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی ‏ ‏ آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ ‏ ‏ دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے ‏ ‏ سارے بجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

محبت کا یہ پیغام اردو کے کسی اور شاعر نے شاید ہی دیا ہو۔ اگر چہ میر تقی میرؔ نے بھی کہا تھا ؎

میرؔ کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

مگر ہمارے ناقص خیال میں یہ مذہبی رواداری نہیں تھی یہ تو مذہبی بیزاری تھی۔ مذہبی عناد اور قومی انتشار سے اقبال کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ ان کا دل اس درجہ بے تاب تھا کہ آن واحد میں تمام انسانوں کو متفق اور متحد دیکھنا چاہتا تھا۔ کیا اردو کے علاوہ بھی کسی ہندوستانی شاعر کے یہاں ایسا کرب اور درد پیدا ہوا ہے؟ اگر نہیں تو یہ امتیاز یہ افتخار اردو اور صرف اردو کو حاصل ہے کہ اس نے سارے ہندوستان کو ایک ہی رشتے میں باندھنا چاہا ہے۔

اس کے بعد اقبال کے یورپ جانے کا زمانہ ہے۔ وہاں سے واپسی پر بھی اقبال کا رویہ ایسا ہی رہا۔ انھوں نے اس زمانے میں ''سوامی رام تیرتھ'' ''نانک'' اور ''رام'' جیسی یادگار نظمیں کہیں۔ کیا نظم رام کے اشعار سے اقبال کی مذہبی رواداری کا اعلان نہیں ہوتا؟ وہ

ہندوستان کے عظیم انسان کو ایک عظیم خراج تحسین ادا کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند

یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شام ہند

تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

(بانگ درا ۱۷۷)

شاعری کے علاوہ عام زندگی میں بھی اقبال بلا مذہب وملت دیانت داری کے قائل تھے۔ زندگی کے دیگر معاملات میں بھی حقیقت اور رواداری ان کے پیش نظر رہا کرتی تھی۔ سید مظفر حسین برنی صاحب کا ایک اقتباس ہم جناب رام پرکاش کپور کے حوالے سے اس لیے نقل کررہے ہیں کہ اس میں کسی شک کا شائبہ نہ رہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''ان کے دوستوں اور مداحوں کے بیان کیے ہوئے بہت سے قصے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ایک کشادہ ذہن انسان تھے اور انسان دوستی نیز ہمدردی کا بھی جذبہ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں دو واقعات درج کرتا ہوں۔ پہلا واقعہ عبدالرشید طارق بیان کرتے ہیں۔ علامہ اقبال کی قیام گاہ کے نزدیک ہی ایک سنیما تھا۔ ایک بار انھوں نے سنیما کے شور وغل کی طرف علامہ کی توجہ دلاتے ہوئے دریافت کیا آپ جیسے فلسفی اور شاعر کے آرام میں اس سے خلل نہیں پڑتا؟ علامہ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مجھے تو عادت سی پڑ گئی ہے۔ انھوں نے جب ان کو کوٹھی بدلنے کی صلاح دی تو علامہ نے بتایا کہ اصل بات یہ ہے کہ اس کوٹھی کے وارث دو یتیم ہندو بچے ہیں جنھیں میں ۱۳۰ روپے کرایہ دیتا ہوں۔ میں نے اگر یہ کوٹھی چھوڑ دی تو اتنا کرایہ شاید ان یتیموں کو نہ مل سکے۔''

دوسرے واقعے کے راوی جلا الدین اکبر ہیں۔ یہ اسٹیٹ اسکالرشپ کا معاملہ تھا جس کے تحت ایم۔اے فارسی میں اول آنے والا طالب علم اعلیٰ تعلیم کے لیے

برطانیہ جانے کا مستحق قرار پاتا تھا۔ ۱۹۲۹ میں اقبال ایم۔اے فارسی کے صدر ممتحن اور پیپر سیٹر (Papersetter) تھے۔ اکبر صاحب نے ایم۔اے کے امتحان میں شرکت کی لیکن ان کے پرچے حسب توقع اچھے نہ ہوئے۔ چنانچہ ان کی سفارش کے لیے حافظ محمود شیرانی اور عبدالقادر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ اکبر فیل ہوگئے تو اسٹیٹ اسکالرشپ کوئی ہندو لے جائے گا۔ اقبال نے جواب دیا کہ میں جانتا ہوں امیدوار کو فارسی بہت اچھی آتی ہے۔ وہ ایک اچھا شاعر بھی ہے اور ہونہار طالب علم بھی۔ لیکن جو مستحق ہے اسے ہی اسکالرشپ ملنا چاہیے۔ چنانچہ اس سال یہ اسکالرشپ صرف دو نمبروں کے فرق سے ایک ہندو طالب علم کو مل گیا۔ وہ طالب علم فارسی کے مشہور اسکالر اور ادیب ہیرا لال چوپڑہ تھے جو بعد میں کلکتہ یونیورسٹی میں شعبہ فارسی کے صدر تھے۔ انھوں نے خود بھی اس واقعے کی تصدیق کی تھی۔''

(محبِّ وطن اقبال ص ۱۳۵۔۱۳۴)

ان دو واقعات کے علاوہ ہم نے اپنے مقالے کو بانگ درا تک محدود رکھا ہے ورنہ بال جبریل اور ضرب کلیم میں بھی مذہبی تعظیم، مذہبی تکریم اور قومی ہم آہنگی کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

من کی دنیا میں دیکھا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

وغیرہ بہت سی ایسی مثالیں ہیں جن میں اقبال نے مذہب کو مذہب کے قریب لانے کی کوشش کی ہے اور ایک کے لیے دوسرے کی بعض باتوں کو جائز قرار دیا ہے۔ انھوں نے مذہب کی محبت کے لیے مذہب کو اپنایا۔ لیکن غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ جس مذہب کو، محبت کو، اخوت کا علم بردار بنایا تھا آج اس کو منافرت اور دشمنی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ مذہب کو مذہب کے خلاف بھڑکا کر انسان کو انسان کا دشمن بنایا جا رہا ہے۔ کیا یہی آئین انسانیت ہے؟ اگر نہیں تو انسانی بہبود کی نظر سے یہی اردو اور غیر اردو کا فرق ہے۔ اردو ہر دل عزیز زبان ہے۔ دلوں کو ملانے اور رشتوں کو جوڑنے والی زبان ہے یہاں اس کے ہم پلہ شاید کوئی اور دوسری زبان نہیں۔

☆☆☆

اقبال اور حب الوطنی

حب الوطنی کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے، جس جگہ رہتا، پلتا اور بڑھتا ہے اسے اس جگہ سے محبت ہو ہی جاتی ہے۔ اقبال ہندوستان میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے۔ یہاں کی فضاؤں میں زندگی گذاری اس لیے انھیں بھی اپنے وطن سے محبت لازمی تھی۔ اگر ان کی شاعری اور حیات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اقبال کو ہندوستان کی خاک، ہواؤں، فضاؤں، ندیوں، پہاڑوں، چشموں، میدانوں، شہروں اور یہاں کی نامور ہستیوں سے بے پناہ محبت تھی۔ یہ امر بھی بدیہی ہے کہ غیر معمولی شخصیت کی حب الوطنی بھی غیر معمولی قسم کی ہوگی۔ اقبال کی شاعری کا آغاز کچھ انوکھے اور نرالے انداز میں ہوا۔ یہ بات بڑی عجیب ہے کہ اقبال کی نظم گوئی کی ابتدا ہی حب الوطنی سے ہوئی اور ان کی شہرت کی ابتدا بھی اس نظم سے ہوئی جو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھی گئی تھی۔ اس نظم کا عنوان ''ہمالہ'' ہے اور بانگ درا کی سب سے پہلی نظم ہے۔ یہ اردو زبان وادب میں ایک نئے طرز کی نظم ہے۔ اس سے قبل اس نوع کی نظمیں لکھنے کا رواج عام نہ تھا۔ لیکن اس نظم کی جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ یہی ہے کہ یہ حب الوطنی کے اظہار کی خاطر لکھی گئی تھی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہمالہ پہاڑ کے موضوع پر لکھی جانے والی یہ اردو زبان کی پہلی نظم تھی اور غالباً جدید ہندوستانی زبانوں میں بھی سب سے پہلی۔ اور یہیں سے اردو میں وطن عزیز سے متعلق مختلف فطری اشیا کے بارے میں لکھنے کی راہ ہموار ہوئی ہے۔ اقبال کی نگاہ میں ہمالہ صرف ہندوستان کا ایک بلند اور خوبصورت پہاڑ ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی عبرت گاہ ہے جس کے دامن میں ہزاروں سال کی داستانیں مخفی ہیں۔ وہ اس کو ہندوستان کی سرحد کی اونچی دیوار کہتے ہیں جس کے استقبال میں آسمان بھی جھک گیا ہے اور پیار میں اس کی پیشانی کو بوسہ دیتا ہے۔

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں — تو جواں ہے گردش شام وسحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بنیا کے لیے

یہ وہی پہاڑ ہے جس کے متعلق اقبال نے اپنی مشہور زمانہ نظم ''ترانہ ہندی'' میں کہا تھا۔

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اقبال نے اس پہاڑ کو ہندوستان کا محافظ اور پہرہ دار بھی کہا ہے اور بتایا ہے کہ اسی پہاڑ کی وجہ سے ہندوستان جنت کی مانند سرسبز و شاداب نظر آتا ہے۔ یہ خیال اقبال کا پرانا خیال ہے۔ بانگ درا کی نظم ہمالہ میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو پاسباں اپنا ہے تو دیوار ہندوستاں ہے تو
مطلع اول فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو سوئے خلوت گاہ دل دامن کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہر عالم تاب پر

ہمالہ کے علاوہ ہندوستان کی فضا میں دوسرے پہاڑی علاقوں اور میدانوں کا تذکرہ بھی اقبال کے کلام میں جابجا ملتا ہے۔ بانگ درا ہی میں دو نظمیں ''ایک پہاڑ اور ایک گلہری'' اور ''ابرِ کوہسار'' ہندوستانی دیہاتی فضاؤں کی عکاسی کرتی ہیں۔

فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

پہاڑوں، میدانوں اور کہساروں کے علاوہ اقبال کو ہندوستان کے دریاؤں اور ندیوں سے بھی محبت ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ہندوستان کی ندیوں کا ذکر بھی بڑے معنی خیز انداز میں کرتے ہیں۔

چشمۂ کہسار میں دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں صحرا میں ویرانے میں آبادی میں حسن

وغیرہ بہت سے اشعار اور بہت سی نظموں میں پہاڑوں اور دریاؤں کا ذکر آتا ہے جو اقبال کی وطن عزیزہ ہندوستان سے بے حد محبت کی علامات ہیں۔ لیکن اپنی نظموں میں اقبال نے دو ندیوں کا نام لے کر ان کو اپنے اشعار میں اس طرح باندھا ہے ان کا تذکرہ زندہ و جاوید کردیا

ہے۔ ندیوں کا تذکرہ بھی اردو شاعری میں نئی روایت کی بنیاد ہے اور یہ شرف بھی اقبال ہی کو حاصل ہے کہ ان سے پہلے کسی اردو شاعر بلکہ ہندوستان کے کسی غیر اردو شاعر نے بھی ہندوستان کی ندیوں پر نظمیں نہیں لکھیں۔ اقبال نے جن ندیوں کا نام اپنے اشعار میں لیا ہے ان میں گنگا، جمنا اور راوی سرفہرست ہیں۔ مذکورہ دو ندیاں یعنی گنگ وجمن تو ہندوستان کی مقدس ندیوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ لیکن اقبال نے راوی کا ذکر بھی اپنی نظم ''کنار راوی'' میں کیا ہے۔ ندی کا حسین اور دلکش منظر انھوں نے اپنی نظم ''ایک آرزو'' میں بھی کھینچا تھا لیکن اس نظم میں کسی ندی کا نام نہیں لیا گیا صرف ہندوستانی ماحول کی عکاسی کی گئی تھی۔ ''کنار راوی'' نام کی نظم میں راوی کے دلنشیں منظر کو پیش کیا گیا ہے جہاں آنکھوں کے لیے ہی نہیں بلکہ دل کے لیے بھی طمانیت کا سامان مہیا ہے۔

سکوت شام میں محو سرود ہے راوی　　نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیام سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو　　جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو

سرِ کنارۂ آب رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

ترانہ ہندی میں گنگا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

اے آبِ رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو؟
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

علی سردار جعفری نے اپنی کتاب ''اقبال شناسی'' میں لکھا ہے کہ یہاں اقبال کی مراد آریوں کے قافلوں سے ہے۔ جب وہ ہندوستان آکر ندیوں کے کنارے خیمہ زن ہوئے۔ اقبال کے یہاں حب الوطنی کا ایک اور رخ بھی نظر آتا ہے جس میں اقبال ہندوستان کے علماء صلحاء اور رشیوں منیوں سے محبت اور احترام کو ظاہر کرتے ہیں جہاں وہ غالب، داغ اور ہمایوں وغیرہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں وہیں وہ گوتم، نانک، سوامی رام تیرتھ اور رام چندر جی کو بھی نہایت ادب اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں بانگِ درا میں ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''، ''سوامی رام تیرتھ'' اور ''رام'' بے حد قابل ذکر ہیں۔ ''سوامی رام تیرتھ'' میں انھوں نے سوامی جی کے انتقال پر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سوامی جی فلسفۂ وحدت الوجود کے ماننے والے تھے۔ اقبال نے اس نظم میں ان

کے اسی فلسفے کو نمایاں کیا ہے اور اس طرح ایک فلسفی نے ایک فلسفی کو خراج تحسین ادا کی ہے۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے آب تو پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو
آہ کھولا کس ادا سے تو نے راز رنگ و بو میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیاز رنگ و بو
نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

اس طرح ہندوستان کی سب سے مشہور اور مقبول ہستی رام چندر جی کو بھی اقبال نے نہایت ادب اور احترام کے ساتھ یاد کیا ہے۔ انھوں نے ان کی دیانت داری اور شجاعت کی تعریف کی ہے اور بہت ہی پُر اثر انداز میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے۔

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

اس کے علاوہ وشوامتر اور بھرتری ہری کو بھی اقبال نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بال جبریل کا پہلا شعر ہی اقبال نے بھرتری ہری کے ایک اشلوک کو ترجمہ کر کے لکھا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر مرد نادان پر کلام نرم و نازک بے اثر

اس کے علاوہ بہت سی نظمیں اقبال نے ہندوستان کی تعریف و بڑائی میں اور اس کی حالت زار سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ ترانہ ہندی جو اگست ۱۹۰۴ء میں لکھی گئی وہ تو ہمارے آزاد ہندوستان کا غیر آئینی قومی گیت بن گیا ہے اور جس کے اشعار ہندوستان میں بچے بچے کی زبان پر ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

مذکورہ آخری شعر تو موجودہ ہندوستان میں صلح و آشتی کا بے مثل پیغام ہے۔ جس کو گھر گھر پہنچانے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کی ابتری اور غلامی کی حالت سے متاثر ہو کر بھی اقبال نے متعدد نظمیں لکھیں جن میں ''پرندے کی فریاد'' بھی قابل ذکر ہے جس میں یہ شعر۔

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

غلامی کے دور سے آزادی ہندوستان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قومی و ملکی حالت پر

سب سے زیادہ عمدہ نظم ''تصویر درد'' ہے۔ اس نظم میں ہندوستانیوں کی خستہ حالت پر آنسو بہائے گئے ہیں اور انھیں بتایا گیا ہے کہ تمھارے سنبھل جانے سے ہی ہندوستان کی حالت سنبھلے گی۔

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
چھپا کر آستین میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

آپسی محبت اور میل جول کی تعلیم دیتے ہوئے لکھتے ہیں

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں غلامی ہے اسیر امتیاز ماوتو رہنا
نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کو ہندوستان کی ہر شے سے محبت ہے۔ کیا پہاڑ، کیا دریا، کیا میدان اور کیا انسان اور یہ انداز اقبال کی حب الوطنی کا ایک انوکھا انداز ہے۔ ملک کے ہر تکلیف دہ حادثہ سے اقبال کو تکلیف پہنچتی ہے۔ جب امرتسر میں جلیانوالہ باغ میں قتل و غارت گری کا حادثہ پیش آیا ہے تو اقبال کے دل کو دھکہ لگا اور وہ کہہ اٹھے ؎

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

وقت کے ساتھ ساتھ اقبال کی حب الوطنی کا یہ دائرہ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ آگے چل کر وہ پوری دنیا اور پوری انسانیت کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ ان کے وطن کا دائرہ پورے کرۂ ارض پر پھیل جاتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں کسی بھی انسان کا دکھ ان کا ذاتی دکھ بن جاتا ہے۔ اور ان کا پیغام ساری انسانیت کے لیے عام ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمر قند

اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اقبال گلوبل محبت وطن کو بھی پار کر جاتے ہیں اور پوری کائنات کو اپنا وطن سمجھنے لگتے ہیں۔ انھیں نبی نوعِ انسان یا پوری عالمِ انسانیت سے محبت اور پوری کائنات سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اس ساری زمین ستارے اور آسمان

سب کو اپنا وطن تصور کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں ۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اس طرح اقبال کی حب الوطنی کے تین دائرے نظر آتے ہیں۔ ایک وہ کہ جس میں اقبال اپنے وطن مولد ہندوستان کی مدح سرائی کرتے ہیں اور اسے سارے جہاں سے اچھا بتاتے ہیں۔ دوسرے جس میں اقبال پوری ایشیاء کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں حصار رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں۔ چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ یہ دائرہ پہلے دائرے سے وسیع تر ہے اور اس میں ایشیاء کے تمام ممالک شامل ہو جاتے ہیں بلکہ کرۂ ارض کے تمام حصے زد میں آتے ہیں۔ لیکن اقبال کے تو طن کا ایک دائرہ اور بھی ہے جو اس دوسرے دائرے سے بہت زیادہ بڑا ہے اور یہ دائرہ کرۂ ارض سے نکل کر عالمِ کائنات تک پہنچ جاتا ہے۔ جس میں اقبال کہتے ہیں

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اور یہ دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں ہے جو لامکاں اور عالمِ لاحوت تک کو محیط ہے۔

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا

اور یہ وہ منزل یا وہ وطن ہے جہاں آدم خاکی جوہر براقی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی انسان آسمانی مخلوق بن جاتا ہے۔

☆☆☆

جنگِ آزادی کے مجاہدِ اعظم ــــ ڈاکٹر اقبال

''انقلاب'' کا نعرہ بخش کر اقبال نے آزادی اور اردو دونوں پر احسان کیا ہے جس کا بدلہ رہتی دنیا تک عالم انسانیت سے چکایا نہ جاسکے گا۔ اگر چہ یہ نعرہ سب سے پہلے جنگ آزادی کے ایک مجاہد شہید بھگت سنگھ کی زبان سے ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو سردار اس وقت ادا ہوا جب اس کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا جارہا تھا۔ لیکن اس کا اصل احساس اور بنیادی نظریہ اقبال ہی نے عطا کیا۔ وہ بھگت سنگھ سے بہت پہلے ۱۹۲۷ء سے قبل ''زبورِ عجم'' میں کہہ چکے تھے ؎

خواجہ از خون رگِ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے وہ خدایاں کشت دہقا ناں خراب
انقلاب
انقلاب! اے انقلاب

یہ زبور عجم کے حصہ دوم کی منظومات کی تیسویں نظم ہے جس میں ٹیپ کا بند ہی اقبال نے انقلاب! انقلاب اے انقلاب کو بنایا ہے۔ اس نظم کے تمام اشعار میں مزدوروں کے احتجاجی جلوس انقلاب انقلاب! اے انقلاب کی گونج کے فلک شگاف نعرے سنائی دیتے ہیں۔ سیاسی بیداری کا یہ انقلابی شعور مشرقی دنیا کو سب سے پہلے اقبال نے ہی دیا، جس پر ہند اور اہلِ ہند جس قدر ناز کریں کم ہے۔ اس لحنِ داؤدی کی داد اقبال ''بندگی''، ''غلامی''، ''مزدور'' اور ''نوائے مزدور'' جیسی نظمیں پیام مشرق میں لکھ کر ۱۹۲۲ء میں حاصل کر چکے تھے اور اسی صدائے قم باذن اللہ کا اعلان پیام مشرق سے دس سال قبل ۱۹۱۲ء میں ''بانگِ درا'' کی ''نوید صبح'' کی شکل میں یوں اظہار کر چکے تھے ؎

مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق گرم تقاضا تو بھی ہو

اقبال کا یہ جذبہ سینہ اقبال میں اواخر حیات تک جاری و ساری رہا۔ ۱۹۳۳ء میں

سواد رومتہ الکبریٰ میں ''مسجد قرطبہ'' میں بیٹھ کر ایسے گویا ہوئے کہ فصیل گردوں ہل اٹھی۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح اُمم کی حیات کشمکش انقلاب

اور زندگی کے آخری ایام میں ''پس چہ باید کرائے اقوام مشرق'' میں زبور عجم والے مصرعہ کو اس طرح دہرا کر آسمان چیر دیا۔

کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب! اے انقلاب! اے انقلاب

ہندوستان کی جنگ آزادی کے دوران اقبال نے دلوں کو وہ تڑپتی پھڑکتی زندگی اور ایسا نیا جوش اور تازہ ولولہ عطا کیا کہ راکھ کے ڈھیروں میں آگ لگ گئی۔

یہی وہ زندہ تمنا ہے جو طبیعت کو گرماتی روح کو تڑپاتی اور دل ویران میں شورشِ محشر بپا کرتی ہے اور یہی وہ پیغام ہے جس کو اقبال قعرِ مذلت میں پڑی قوم تک پہنچاتے رہے۔ غلامی کا منحوس اور قابلِ نفریں تصور نہ صرف لعنت اور جمود زندگانی کا باعث ہے بلکہ اقبال کے نزدیک مردہ دلی کی نشانی ہے۔ اس غلامانہ زندگی سے نجات دلانے کے لیے اقبال خود عمر بھر روئے اور دوسروں کو رلاتے رہے۔ ۱۹۰۴ء میں ''تصور درد'' میں اس طرح نالہ زن ہوئے۔

نہ سمجھو گے مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا افسانہ سب فسانوں میں

قوم کی غلامانہ ذہنیت کو دور کرنے اور اسے قعر غلامی سے نکالنے کے لیے اقبال نے ہمیشہ آزادی کے شعلہ آفریں گیت گائے۔ ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے مخاطب زیادہ تر محکوم اور غریب عوام رہے۔ بال جبریل میں ''فرمانِ خدا'' میں جامِ حیات آفریں پلا کے یوں قیامت برپا کرتے اور مژدہ جمہوریت سناتے رہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

یہ کیسا آشناک مژدہ ہے۔ امام اشتراکیت کارل مارکس بھی اپنا پیغام اس قدر شعلہ آفرینی کے ساتھ نہ پہنچا سکا ہوگا۔ ایسا لگتا ہے گویا مارکسی فلسفہ کی ساری روح آکر ان اشعار میں جمع ہوگئی ہے۔ ممکن ہے اسی لیے یہ نظم کمنسٹوں کی بائیبل اور ان کے مذہب کا ترانہ مشہور ہوئی ہو۔ ''لینن خدا کے حضور'' میں بندۂ مزدور کی خیر سگالی اور آمریت کی تباہ حالی کی خواہش کا اظہار جن الفاظ میں اقبال نے کیا ہے، اس کی انقلاب آفرینی کا اندازہ آپ خود لگائیں ۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

شاید یہی وہ قیامت خیز پیغام تھا جو روس کی گرمیِ گفتار سے متاثر ہوکر آمریت کو تہہ خاک کرنے والا ''اعلانِ جنگ'' تھا۔ غلام ہندوستان کے باشندوں کے دلوں کو اقبال اسی طرح گرماتے اور ان میں نئی روح پھونکتے رہے۔ اقبال کے مذہبی رنگ نے اس پر سونے پہ سہاگہ کا کام کیا۔ اس مقولہ کو کہ خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ اقبال نے ذرا سی تبدیلی کے ساتھ کتنا زندہ اور پھڑکتا ہوا مفہوم پیدا کر دیا۔

ترا تن روح سے نا آشنا ہے
عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے

اقبال کے ملک کی آزادی کے ہنگامہ پرور اور غلغلہ آفریں اشتیاق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے عالم کو آزاد اور خود مختار دیکھنا چاہتے تھے۔ جب ۱۹۰۵ء میں اقبال نے اعلا تعلیم کے لیے یورپ کا رُخ کیا تو بمبئی میں اقبال کی ملاقات ایک یونانی سوداگر سے ہوئی جو تجارت کی غرض سے افریقہ کے ایک صوبے ٹرانسوال جا رہا تھا جہاں کوئلے، تانبے، لوہے، سونے اور ہیرے وغیرہ کی بہت سی کانیں ہیں۔ اقبال نے جب اس سے پوچھا کہ چین میں تم کیا کام کرتے تھے تو اس نے جواب دیا سوداگری کرتا تھا لیکن چین والے ہماری چیزیں نہیں خریدتے۔ تو یہ سن کر اقبال کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ چینیوں نے یورپ والوں کے ساتھ عدم تعاون کا رویہ اختیار کیا ہوا ہے اور وہ اس

طرح ان کو نکال باہر کریں گے۔ اس فرطِ مسرت میں اقبال بے اختیار کہہ اٹھے:

''شاباش چینیو شاباش! نیند سے بیدار ہو جاؤ۔ ابھی تم آنکھیں ہی مل رہے ہو کہ دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی۔'' (خطوط اقبال۔ ۸۱)

شاید اسی خیال کو اقبال نے بال جبریل کی نظم ''ساقی نامہ'' میں یوں بیان کیا ہے۔

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ سے چشمے ابلنے لگے

اقبال کی دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ انگریز حکومت کے آخری دن آ گئے ہیں اور ان کا اقتدار کچھ دن کا ہے۔ ہندوستان سے ان مداریوں کا کھیل ختم ہونے والا ہے۔

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش راز فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بے زار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

غالباً اقبال ہی ایشیا کا وہ اولین شخص ہے جس نے انقلاب روس پر سب سے پہلے خوشی کا اظہار بیانگِ دُہل کیا اور کارل مارکس کے حریت پسندانہ خیالات کی تشریح کی اور روس کی اس آزادی کو ایشیا کی آزادی کا پیش خیمہ قرار دیا۔ خضر راہ میں شعلۂ نوا کو اس طرح بلند کیا کہ اردو ادب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

بندۂ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے — سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
مکر کی چالوں سے بازی کھا گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

جب ترکی پہلی جنگ عظیم کی آگ میں جھلس رہا تھا اور ۱۹۱۱ء میں روس و برطانیہ متحد ہو کر ترکی و ایران پر ٹوٹ پڑے تھے اور امت مسلمہ کے ان مٹتے ہوئے نشانوں کو اہل عرب تماشائی بنے دیکھ رہے تھے۔ خدا کا دین اور اہلِ ایمان دنیا میں رسوا کیے جا رہے تھے۔ اقبال بھلا کب اس بات کو گوارا کر سکتے تھے۔ ان کی آزادانہ طبیعت اس اہانت کو برداشت نہ کر سکی اور انجمن حمایت الاسلام کے ایک جلسے میں کھڑے ہو کر جب بھرائی ہوئی آواز میں پڑھا۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دین مصطفیؐ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش
آگ ہے اولاد ابراہیمؑ ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے

تو خود بھی روئے اور لاکھوں کے مجمع کو زار و قطار لایا۔ لوگوں کی ہڑکیاں بندھ گئیں۔ دامن آنسوؤں سے بھیگ گئے۔

یہ تھا وہ پُر سوز نغمہ جسے ہندوستان کی فضا میں سنا کر اقبال قوم کے خون کو گرماتے تھے اور آزادیٔ ہندوستان کے لیے کروڑوں ہندستانیوں کے جسمانی خمیر میں حریت کی آگ پھونک دیتے تھے جو سنتا تھا آزادی کی تڑپ سے سرشار اور تازگی، جوش، ولولہ، توانائی، ہمت، جواں مردی، نیز جوان امیدیں لے کر واپس ہوتا تھا اور گریہ اقبال کی شکل میں آزادی کے راگ الاپتا ہوا اٹھتا تھا اور اس طرح ہندستان کی جنگِ آزادی کا مرد مجاہد بن کر انگریزوں کے مقابلے ڈٹ جاتا تھا۔

ہندوستان کے بڑے مجاہدین آزادی اقبال کے کلام کو سن کر پھڑک اٹھتے اور آزادی کی خاطر بڑی آسانی سے جان دینے کے لیے تیار ہی نہیں بلکہ جام شہادت نوش کرنے کی آرزوئیں اور امنگیں لے کر میدان کارزار میں کود پڑتے تھے۔ علی سردار جعفری نے اپنی کتاب اقبال شناسی میں ایک بڑا عجیب واقعہ نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ غالباً ۲۱۔۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ کسی انگریز سرکار پرست اخبار میں ایک کارٹون

شائع ہوا جس میں مادر ہند ایک عورت کی شکل میں ہے۔ اس کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے اور مہاتما گاندھی ایک طوفانی سمندر کے کنارے ایک چٹان پر اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ گویا اسے یقینی موت کی طرف لے جا رہے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں کے دفتر کے کوئی صاحب وہ اخبار لے کر اقبال کے پاس گئے۔ اقبال نے اس کے نیچے چار مصرعے لکھ دیے جس سے کارٹون کا مفہوم بدل گیا۔ یہ قطعہ ''پیام مشرق'' میں شامل ہے ؂

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است
بہ دریا غلط و با موجش در آویز — حیات جاوداں اندر ستیز است

(ترجمہ: دریا کے ساحل پر بزم آرائی نہ کرو۔ وہاں زندگی کا نغمہ بہت نرم ہوتا ہے۔ دریا میں کود جاؤ اور اس کی موجوں سے دست و گریباں ہو کر دیکھو لافانی زندگی جدوجہد میں پنہاں ہے۔) (اقبال شناسی۔ ص ۴۳)

اقبال نے کتنی آسانی اور خوبی کے ساتھ کارٹون کا رُخ آزادی کی طرف موڑ دیا۔ بات کیا تھی اور اقبال نے چار مصرعے لکھ کر اسے کہاں پہنچا دیا۔ گویا موت کے پیغام کو حیات جاوداں میں تبدیل کر دیا۔

انگریز مسلمانوں کو طرح طرح کی چالوں میں پھنسا کر لقمۂ اجل بنانا چاہتے تھے۔ اقبال ان چالوں سے اچھی طرح باخبر تھے۔ اس دور کا ایک عجیب واقعہ حکیم محمد یوسف مدیر نقوش لاہور کی زبانی سنیے کہ اقبال نے ہندوستان میں انگریز کی چال کو کس طرح ناکام بنا دیا۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں:

''ایک دن علامہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ مولانا ظفر علی خاں بے حد گھبرائے ہوئے آئے۔ علامہ نے پوچھا: ''خیر باشد؟'' ''خیریت کہاں ہے؟'' ''کیوں؟'' حکومت نے ایک سرکلر لیٹر اخبارات کے نام بھجوایا ہے کہ حکومت اپنی طرف سے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے پانچ لاکھ رقم کا عطیہ دے گی اور پانچ لاکھ روپے تمام مسلمان اس فنڈ کے لیے جمع کریں۔ دس لاکھ روپے کے سرمایہ سے حجاز میں ہسپتال بنوائے جائیں گے کیونکہ حج کے موقعے پر حاجیوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔''

''پھر؟'' مولانا تو پہلے ہی پریشان اور حد درجہ مضطرب دکھائی دے رہے تھے، انھوں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا کہ انگریزوں کی چال ہے۔ سیاست ہے، قوموں کا دل

موہنے کی افسوں گری ہے۔ وہ مسلمانوں کو اس طریقہ سے دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ یہ فرنگی جہاں بھی رفاہی ادارے بنواتے ہیں ہسپتال قائم کرتے ہیں، وہاں اپنی ترکیبوں سے اپنے پاؤں جماتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اپنا اثر و رسوخ پھیلا کر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اسی لیے اب حجاز بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے گیا۔''

یہاں تک پہنچ کر مولانا کی حالت بہت متاثر ہوگئی۔ ان پر رقت طاری ہوگئی اور مجھے خطرہ پیدا ہوگیا کہ مولانا ظفر علی خاں اب روئے کہ اب روئے!! علامہ نے فرمایا: ''مولانا! آپ کے شبہات میں وزن ہے اور معاملہ بے شک سنجیدہ ہے۔ مگر آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ تدبیر ہو ہی جائے گی۔ آپ شام کے قریب چپراسی بھیج کر کچھ اشعار منگوا لیجیے۔ میں چند شعر لکھ دوں گا۔ وہ اپنے اخبار میں چھاپ دیجیے۔ پھر نہ کوئی چندہ دے گا نہ اس تحریک کی کوئی قدر و اہمیت ان کے دل میں پیدا ہوگی۔ نہ ہسپتال بنیں گے اور نہ فرنگی کی یہ چال کامیاب ہوگی۔''

چنانچہ اقبال نے ''شفاخانہ حجاز'' کے نام سے ایک نظم لکھی جو روزنامہ زمیندار میں دوسرے دن صبح کے شمارے میں شائع ہوگئی۔ نظم کے چھپنے کی دیر تھی کہ تمام ملک میں آگ لگ گئی۔ سوئی ہوئی قوم بیدار ہوگئی۔ اس نے وہ خطرات بخوبی محسوس کر لیے جو حجاز میں فرنگی ہسپتالوں سے وجود میں آسکتے تھے۔ مسلمان باخبر ہو گئے اور انگریز کی اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔''

(نقوش اقبال نمبر ۴۳۷۔۴۳۹) (اوراق گم شدہ: ۵۴۔۵۵)

نظم ملاحظہ ہو ؎

ایک پیشوائے قوم نے اقبال سے کہا — کھلنے کو جدّہ میں ہے شفاخانۂ حجاز
ہوتا ہے تیری خاک کا ہر ذرّہ بے قرار — سنتا ہے تو کسی سے جو افسانۂ حجاز
دست جنوں کو اپنے بڑھا جیب کی طرف — مشہور تو جہاں میں ہے دیوانۂ حجاز

دارالشفا حوالیِ بطحا میں چاہیے
نبضِ مریض پنجۂ عیسیٰؑ میں چاہیے

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات — پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا — پایا نہ خضر نے مئے عمرِ دراز میں

اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں

آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا

رکھتے ہیں اہل درد مسیحا سے کام کیا؟

۱۹۱۱ء میں مسلمانوں کو خوب تختۂ مشق ستم بنایا گیا۔ طرابلس میں ترکوں کو آگ اور خون سے سابقہ پڑا۔ چاروں طرف مسلمانوں کی بربادی اور تباہی کے سامان مہیا تھے۔ ان دنوں اقبال کے دل پر کیا گذری ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ البتہ ان کے کلام کی روشنی میں چند نشانات اس امر کی تائید میں مل جاتے ہیں کہ اقبال کا دل بہت غم گین تھا جو کچھ ان کی نگاہ راز دیکھ لیتی تھی اقبال نے وہ منظر دوسروں کو کس طرح دکھا کر چھوڑا اور انگریزوں کی غلامی سے نجات کا صور جس لحن میں پھونکا، اس کا بیان حکیم محمد یوسف ہی کی زبانی سنیے:

''شاہی مسجد لاہور میں مسلمانان لاہور نے ایک جلسہ کیا تھا... شاہی قلعہ اور بارہ دری کے سامنے اورنگ زیب کی عظیم مسجد (شاہی مسجد) میں ہزاروں مسلمان جمع ہوئے۔ اس جلسے میں مسلمانوں کے کئی لیڈر بلکہ سب ہی لیڈر موجود تھے۔ سر شفیع سر فضل حسین، میاں نظام الدین، مولوی محبوب عالم، میاں عبدالعزیز وغیرہ اول چند زرولیوشن پڑھے گئے۔ اس کے بعد علامہ اقبال سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ ہجوم میں پندرہ بیس ہزار مسلمان ہوں گے۔ جوش کا یہ عالم تھا کہ جذبات کو قابو میں رکھنا محال ہو رہا تھا۔ آئے دن تو اسپین حکومتیں اسلامی ریاستوں کو اجاڑنے اور ان پر قبضہ جمانے کے لیے کسی نہ کسی ملک پر چڑھائی کر دیتی تھیں۔ ان دنوں طرابلس اور اٹلی والوں کے درمیان جنگ ہو رہی تھی۔ ان ہی ایام میں علامہ اقبال نے جنگ طرابلس پر ایک نظم لکھی تھی اور اب آپ ہی کے منہ سے سنی جانے والی تھی۔ نظم پڑھنے سے پہلے سر شفیع، میاں فضل حسین اور مولوی محبوب عالم صاحب اڈیٹر روزنامہ پیسہ اخبار ایسے اکابرین نے بڑی آشتیں تقریریں کیں جن میں اٹلی کے خلاف مسلمانوں نے اپنے غیض و غضب کا اظہار کیا تھا۔ جب علامہ نے نظم سنانی شروع کی تو مجمع پر ایک عجیب قسم کا سکوت طاری ہو گیا۔ اس وقت فرش پر ایک سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔

ملاحظہ ہو علامہ اقبال کی نظم حضور رسالت مآبؐ میں ؎

گراں جو مجھ پہ ہنگامۂ زمانہ ہوا جہاں سے باندھ کر رخت سفر روانہ ہوا
قیود شام و سحر میں بسر تو کی لیکن نظام کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزم رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمتؐ میں لے گئے مجھے کو

کہا حضور نے اے عندلیب باغ حجاز کلی کلی ہے تری گرمیِ نوا سے گداز
ہمیشہ سر خوش جامِ ولا ہے دل تیرا فتادگی ہے تری غیرت سجودِ نیاز
اڑا جو پستی دنیا سے تو سوئے گردوں سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعت پرواز
نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنّت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اِس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اِس میں

علامہ نے جب پوری سرشاری کے ساتھ یہ شعر پڑھا 'مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں، جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی'، تو لوگوں کا تجسس بڑھا۔ سوال پیدا ہوا کہ بھلا وہ کیا چیز ہوگی جو جنّت میں بھی نہیں ملتی۔ اس کے بعد جب علامہ نے یہ شعر پڑھا ؎

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مجمع بے قابو ہوگیا۔ چیخ و پکار، نالہ و بکا، آہ و فغاں سے مسجد کی دیواریں لرزنے لگیں۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ نالۂ وشیون اور آہ و بکا کا ایسا سماں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی جوش اتنا تھا کہ لوگ پاگلوں اور دیوانوں کی طرح کپڑے پھاڑنے لگے۔ کوٹ اتار کر پھینک دیے، پگڑیاں اور ٹوپیاں فضا میں اچھال دیں۔ زمین پر اس طرح لوٹنے لگے جیسے کسی نے ان کو ذبح کرڈالا ہو۔ آدم کی تڑپ کا وہ سماں ضمیرِ کائنات میں اپنی آخری حدوں کو چھو

رہا تھا جو اس چشم فلک نے شاذ ہی دیکھا ہوگا۔ اپنی زندگی میں کسی موت یا کسی بھی موقع پر ایسا دلخراش منظر اپنی آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا۔ جلسہ خود بخود برخاست ہوگیا۔ لیڈران تمام جلد از جلد اسٹیج سے کھسک گئے۔ عوام کا بے پناہ ہجوم مسجد سے باہر کی طرف لپکا جارہا تھا۔ اس کا رخ قلعہ کی طرف ہوگا یا شہر کی طرف! اس واقعہ کے دوسرے یا تیسرے دن میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حاضرین میں سے کسی نے علامہ اقبال کی شاہی مسجد میں پڑھی جانے والی نظم کا ذکر چھیڑا اور کہا حضور! اس دن خیریت ہی گزرگئی ورنہ پبلک کے جوش کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہوگیا تھا کہ کوئی ہنگامہ شدید برپا نہ ہوجائے۔

اس پر علامہ نے فرمایا اچھا ہی ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے جذبات کو قابو میں کرلیا اور اپنے آپ رہے ورنہ میں چاہوں تو اپنے شعروں سے آگ لگادوں مگر میں دیکھتا ہوں کہ ابھی میری قوم تیار نہیں ہے۔

(نقوش اقبال نمبر ۱۹۷۷،ص ۴۲۹۔۴۴۱)

(اوراق گم شدہ ص ۵۴۔۵۵)

یہ اقبال ہی ہیں جنھوں نے ہندوستان کے لیے ترانۂ آزادی ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' لکھا جس سے جنگ آزادی کے بڑے بڑے سپاہیوں کو جیل میں بھی یہ ترانہ پڑھ کر نہ صرف سکون ہی ملتا تھا بلکہ ان کے جوش جہاد میں اضافہ ہوتا تھا۔

صاف ظاہر ہے کہ اقبال ہی کا ترانہ تھا جس نے گاندھی جی کو جیل میں امنگ اور جذبہ دیا اور جو جیل میں بھی مونس وغمگسار ثابت ہوا۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر جو تحریک خلافت کے روح رواں تھے، جن کی تقریر و تحریر سے انگریزوں کا دل دہلتا تھا اور اسی پاداش میں انھیں متعدد بار جیل میں ٹھونسا گیا تھا، ایک دوست کو خط لکھنے بیٹھے تو ''اسرار خودی'' کے چالیس اشعار نقل کرگئے اور آخر میں اس کا اعتراف انھیں خود کرنا پڑا کہ لکھنے تو بیٹھا تھا خط اور نقل کرگیا اقبال کی اسرار خودی۔ ایک بار مولانا محمد علی جوہر لاہور گئے اور وہاں اقبال سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا واقعہ فرزند اقبال جاوید اقبال نے یوں نقل کیا ہے ملاحظہ ہو:

''مولانا محمد علی بحیثیت قائد تحریک خلافت لاہور پہنچے اور اقبال سے ملنے کے لیے

انارکلی والے مکان میں گئے۔ اقبال بیٹھک میں دُھسہ اوڑھنے بیٹھے حقہ کے کش لگا رہے تھے۔ مولانا محمد علی سے ان کی خاصی بے تکلفی تھی۔ مولانا محمد علی نے انھیں دیکھتے ہی طنزاً کہا: ''ظالم! ہم تو تیرے شعر پڑھ کر جیلوں میں چلے جاتے ہیں اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں لیکن تو ویسے کا ویسا دھسہ اوڑھے حقے کے کش لگاتا رہتا ہے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ اقبال نے برجستہ جواب دیا۔ مولانا میں تو قوم کا قوّال ہوں۔ اگر قوّال خود ہی وجدوحال میں شریک ہوکر ہُوحق میں تہہ وبالا ہونے لگے تو قوّالی ہی ختم ہوجائے۔''

(زندہ رود، حصہ دوم) ۲۴۷

اس طرح معلوم ہوا کہ اقبال جنگ آزادی کے مجاہد اعظم تھے۔ نہ صرف آزادی کے قائل تھے اور لوگوں کو آزادی کی ترغیب دیتے تھے بلکہ مجاہدین آزادی کے بڑے بڑے لیڈر بھی اقبال کے کلام سے آزادی کا جذبہ اور جوش حاصل کرتے تھے۔ اور اپنے اشعار سے ہندستانیوں کے دل گرماتے تھے مگر اقبال کی وطن سے کمال محبت اور حصول آزادی کی مسلسل لگن کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال پھر بھی قوم کے عمل سے مطمئن نہ تھے اور اس پر ایک اور توانا کتاب ''ضرب کلیم'' (اعلان جنگ عصر حاضر کے خلاف) شائع کردی لیکن قوم کی بے راہ روی پر پھر بھی افسوس کرتے چلے گئے۔

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضا مند

☆☆☆

سیاسی انقلاب میں اقبال کا حصّہ!

ادب سیاست کا امام ہے۔ دنیا کے بہت سے انقلابات ادب کے اشاروں پر برپا ہوئے ہیں۔ جرمن، فرانس، ترکی، مصر، امریکہ اور روس کے انقلابات رونما ہونے میں ادب کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ خود موجودہ زمانے میں پاکستان کے قیام اور بنگلہ دیش اور ایران کی حکومتیں بدلنے میں ادب نے رہنما کا کردار ادا کیا ہے۔ ادب کے اشارے پر حکومت کی بساطیں الٹ دی گئی ہیں۔ اس ضمن میں بالخصوص شاعروں کو فوقیت حاصل رہی ہے، جنھوں نے پُر جوش ہنگامی نظمیں لکھ کر اپنے زمانے کا نقشہ بدل دیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی بھی ادب کے سہارے لڑی گئی۔ ملکی حریت کی یہ لڑائی لڑنے والوں میں شاعر، ادیب، دانشور، فلسفی، صحافیوں اور وکیلوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے لیکن اردو زبان کے جن جنگی شعراء میں مولانا محمد علی جوہر، اکبرالٰہ آبادی، حسرت موہانی اور رام پرشاد بسمل وغیرہ کے نام صف اول میں شامل ہیں ان سپاہیان حریت میں اقبال کا نام سرفہرست درج ہے۔ اقبال کا بیشتر کلام اسی پس منظر کی یاد تازہ کرتا ہے جو انگریزی حکومت کے دور غلامی میں جمود و تعطّل، بے خبری اور بے عملی کا شکار بنا ہوا تھا۔ اقبال نے اپنے کلام میں سب سے زیادہ زور زندہ دلی، عمل، حرکت، ہمت و جرأت اور بیداری اور قوت پر دیا ہے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ سوئی ہوئی قوم میں جنگ کی روح پھونکے بغیر غلامی کے بڑے عفریت کا مقابلہ ناممکن ہے، چنانچہ اقبال کی بہت سی نظمیں ہنگامی حالات کے پیش نظر صرف جوش عمل کو ابھارنے میں سب سے زیادہ کارگر اور قوم کے اندر نئی قوت اور نئی روح بھڑکانے کے کام آئیں جن کو پڑھ کر جوش اور ولولہ بیدار ہوتا ہے گویا مردہ روح بھی زندہ ہوجاتی ہے۔

اگرچہ اقبال نے ۱۹۰۴ء میں حب وطن کے جوش میں ڈوب کر ''ترانۂ ہندی'' جیسا لازوال ترانہ لکھا لیکن اقبال کی نظریں ملکی سیاسی نظام کے بے ڈھنگے ڈھرّے پر جمی ہوئی تھیں اور خود مختار قیادت کے فقدان سے ان کا دل مجروح تھا کیونکہ اس وقت تک ہندوستان کو کوئی

مدبر رہنما نہیں ملا تھا اور نہ ہی باقاعدہ کسی طرح تنظیمی طور پر ملک کی آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی تھی لیکن ایسے وقت میں جب کہ آزادی کا ہلکا ہلکا خیال لوگوں کے ذہن میں پیدا ہورہا تھا اقبال کا ذہن غلامی کے آزار سے بے زار اور دل آزادی کی لذت کا گرفتار دکھائی دیتا ہے۔ ترانۂ ہندی کے سال تصنیف ۱۹۰۴ء میں اقبال نے ایک طویل نظم ''تصویر درد'' کے عنوان سے لکھی اور حمایت الاسلام کے کثیر مجمع کو آزادیٔ ہندوستان کے جذبے اور انگریزوں کی غلامی سے نجات کی طرف متوجہ کردیا اور ہندوستانیوں کو فکر وطن کی طرف للکارا۔

وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنے والی ہے — تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے — دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کر — زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اس وقت بہانگ وہل تو کیا ادب یا کسی بھی پلیٹ فارم سے دبی ہوئی آواز میں بھی آزادی کی آواز اٹھانے والا فرد واحد بھی میسر نہیں تھا اور اقبال ہیں کہ چلاّ کر غلامی کی لعنت کے زخم کا درد ''تصویر درد'' میں پیش کرتے ہیں۔

اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو — مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

اقبال یورپی سامراج کی پرفریب چالوں سے اچھی طرح باخبر تھے اور اپنے کلام کے ذریعہ اہل وطن کو متنبہ کرتے رہتے تھے۔ روس کے اکتوبر انقلاب ۱۹۱۷ء کے بعد اقبال کی اس ضمن میں سب سے اہم نظم ''خضر راہ'' ہے۔ اس نظم میں یورپی نظام حکومت کی عیاری اور مکر کی چالوں کا پردہ جس سنجیدگی اور بالغ نظری کے ساتھ فاش کیا گیا ہے۔ اس کی دوسری مثالیں ہندوستانی شاعری میں نہیں ملتیں۔ اقبال نے ان شیشہ گران فرنگ کو بری طرح ہدف ملامت بنایا اور حریت پسندوں کے خونِ میں گرمی اور ہمہمہ پیدا کیا۔ ۱۹۱۷ء میں جب مہاتما گاندھی نے جنوبی افیریقہ سے آکر کانگریس کی باگ ڈور سنبھالی تو حصول آزادی کی ایک نئی لہر سارے ملک میں دوڑ گئی۔ بھڑکتے جذبات کے ان شعلوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے برطانوی پارلیمنٹ سے ایک باطل ایکٹ ''گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء'' منظور کیا اور ایک طرح سے جمہوریت کو بحال کیا کہ تمام صوبوں میں پہلی بار مجلس قانون ساز تشکیل دی جس میں کچھ ہندوستانی وزراء کو بھی محدود اختیارات کے ساتھ برائے نام نامزد کیا۔ اقبال نے اسے

انگریزوں کی شاطرانہ سفا کی قرار دیا اور ہندوستانیوں کو آزادی سے بے خبر کرنے اور مکر و فریب میں پھنسانے کی ترکیبیں تصور کیا۔ اپنے ان پُر خلوص جذبات کا اظہار اقبال نے اہل ملک کے سامنے پُر زور الفاظ میں کر دیا۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ ہے آزادی کی نیلم پری

اور پھر ''سرمایہ و محنت'' کے عنوان کے تحت ہندوستان کے غریب عوام کا خون پہلے پہل اس طرح گرمایا کہ اس کی نظیر سے ساری اردو شاعری بلکہ ہندوستانی شاعری قاصر ہے۔

اس نظم کا ایک شعر تو ایسا انقلابی ہے جس میں نہ صرف جوش، جذبہ بلکہ خوش آئند دور کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ اگر چہ اس وقت ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ طلوع نہیں ہوا تھا لیکن اکتوبر انقلاب کی گونج ہندوستان میں سب سے پہلے اقبال کی اسی نظم میں سنائی دیتی ہے، جس کی حقیقی مثال پوری ہندوستانی شاعری میں مشکل سے ملے گی۔

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

جرأتِ حیات اور قوت کی ضرب کے بغیر زنجیر غلامی کا قلع قمع کرنا ممکن نہ تھا۔ اقبال کی شاعری میں ہزاروں اشعار زندگی بخش اور حوصلہ انگیز ملتے ہیں۔ یہاں اقبال کی اسی مذکورہ نظم ''خضر راہ'' سے زندگی میں شمشیر کی تیزی لانے والے اشعار ملاحظہ ہوں۔

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو پختہ ہوجائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو
ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
خاک مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب تا بدخشاں پھر وہی لعل و گہر پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

طاقت غلبہ کی اور کمزوری مغلوبیت کی نشانی ہے۔ اقبال کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستانی عوام کو قوت و عمل کا سبق سکھایا تا کہ یہ بآسانی محکوم و مغلوب بن کر نہ رہ جائیں اور قوت و حوصلہ کی امنگ میں بندِ غلامی کو توڑ ڈالیں۔ بال جبریل کی نظم ابوالعلامعرّی

اس سلسلے کی عمدہ مثال ہے جس میں بڑے فلسفیانہ اور دانشمندانہ طریقے سے قوت کا پیغام دیا گیا ہے جب معرّی نے بھنا ہوا تیتر دیکھا تو اس نے اُس سے یہی سوال کیا۔

اے مرغک بے چارہ ذرا یہ تو بتا تو　　تیرا وہ گنہ کیا ہے یہ ہے جس کی مکافات؟
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو　　دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے　　ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

بانگ درا کی نظموں میں شعلہ بیانی وہ ہے جو ۱۹۲۵ء تک کے ہندوستان کو گرمانے کے لیے ضروری تھی۔ لیکن ۱۹۳۶ء تک آتے آتے اقبال کی بال جبریل کا انداز بدل چکا تھا اور اس کی جگہ فکر و تدبر اور فہم فراست نے لے لی تھی۔ جوش اور ولولہ کے ساتھ اب اقبال مختلف علائم اور رموز سے امت کو آزاد ملک کی سمجھ بوجھ کا درس دے رہے تھے۔ اقتضائے وقت کے مطابق سنجیدہ فہم اور دل جمعی اقبال کی بال جبریل میں موجود ہے۔ ان کی نظم خوش حال خاں خٹک کی وصیت میں کسی غیر ملکی حکمراں کی پرچھائی بھی حریت پسندوں کے مسکن کو گوارا نہیں۔

قہستاں کا یہ بچۂ ارجمند　　مغل سے کسی طرح کمتر نہیں
وہ مدفن ہے خوش حال خاں کو پسند　　کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات
مغل شہسواروں کی گرد سمند　　اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ

بال جبریل کی مایۂ ناز نظم 'ساقی نامہ' میں فرنگی اقتدار کے دفیعہ اور ملک کی خوشی کی خبر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اقبال انگریزوں کی غلامی کو بھاگتے اور دورِ جمہوریت کو آتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ وہ بڑے یقین اور امید افزا الفاظ کے ساتھ کہتے ہیں۔

زمانے کے انداز بدلے گئے　　نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش راز فرنگ　　کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے　　زمیں میر و سلطان سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا　　تماشا دکھا کر مداری گیا

۱۹۳۳ء میں قرطبہ (اسپین) میں دریائے وادالکبیر کے کنارے اقبال نئے انقلاب اور نئے دور کا خواب دیکھتے ہیں اور فرط خوشی میں یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ میں اس راز کو پوشیدہ ہی رکھتا ہوں ورنہ یورپ میری حق گوئی کی تاب نہ لا سکے گا۔

آبِ روان کبیر تیرے کنارے کوئی　　دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں میری نواؤں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھادوں اگر چہرہ افکار سے لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

ملوکیت اور سرمایہ پرستی بھی اقبال کے نزدیک ظالمانہ بت ہیں جن کے خلاف انھوں نے ہمیشہ آواز بلند کی۔ مزدور کی خوشحالی کی تمنائیں اور اس کی آسودگی کی خواہشیں اقبال کے سینے میں مچلتی رہیں کیونکہ اقبال کو معلوم تھا کہ ہندوستان کا انقلاب کمزور، غریب اور مزدور عوام کے ہاتھوں لکھا جاچکا ہے۔ اگرچہ انقلاب ۱۹۴۷ء میں رونما ہوا مگر اقبال ۱۹۳۶ء ہی میں لینن کی زبان سے اس خواہش کا اظہار بڑی شدت کے ساتھ کرچکے تھے وہ خدا کے دربار میں فریادگزار ہیں۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تیری منتظرِ روزِ مکافات

اقبال کی یہ آرزو ''فرشتوں کا گیت'' اور ''فرمان خدا'' میں منضبط جوش اور ولولہ کے منتہائے عروج پر نظر آتی ہے جس کے باعث یہ دونوں نظمیں مزدور کی انقلابی دنیا میں ترانۂ جمہور کا درجہ رکھتی ہیں، یعنی اقبال نے اس عوامی انقلابی تحریک کا آغاز کرکے ہندوستانیوں کا خون گرمانے اور غاصبوں سے لڑ جانے کا درس نہیں دیا بلکہ غلاموں کے سینوں میں آزادی کی آگ لگادی تھی۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے ہٹا دو

بال جبریل کی نظم ''جاوید کے نام'' مہاتما گاندھی کی سودیشی تحریک اور عدم تعاون کی تعبیر ہے۔ اقبال اپنے بیٹے جاوید کو انگریزی (ولایتی) چیزوں سے پرہیز اور ہندوستانی (دیسی) اشیاء کے استعمال کی ہدایت کرتے ہیں۔ خطاب جاوید کے نام سے ہے مگر اقبال کا یہ پیغام ہر اہل وطن کے لیے خودکفیل اور خودنگر بننے کا تقاضا ہے۔

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

ایک وقت ایسا بھی آیا جبکہ کچھ اس طرح محسوس ہونے لگا جیسے اقبال قوم کی غیرت محکومی کو جگانے کے ساتھ ساتھ براہ راست انگریزوں سے ٹکرا بھی گئے اور ان کے اندر حریفانہ احساس بیدار ہوگیا۔ انگریز کی سفاک چالوں کو ابلیس گری تصور کیا اور ''سیاست افرنگ'' کی نظم

کے زیر عنوان فرنگی عیاریوں کو اہل وطن کے سامنے بے نقاب کیا اور ناپاک انگریزی تہذیب اور اقتدار کے خلاف آواز اٹھائی۔

تیری حریف ہے یارب سیاست افرنگ — مگر ہیں ان کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تونے — بنائے خاک سے اس نے دوصد ہزار ابلیس

اقبال کے عمرانی معائنہ نے مشرق و مغرب کی تہذیبوں کو باہم متضاد پایا اور انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان کی اس راز افشانی پر مغربی اقتدار و استعمار کی نظر میں خود اقبال کا وجود بھی کھٹکنے لگا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اقبال جیسا کوئی شخص ملک میں زندہ نہ رہے۔

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز — ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

ظاہر ہے اقبال کے کلام کا ایک مقصد غلامانہ ذہنیت کو ختم کر کے اس میں حریت پسندانہ روح پیدا کرنا ہے۔ انھوں نے بہر طور غلام کے احساس کمتری کو دور کر کے برتری کا احساس پیدا کیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ غلاموں کے خون کی گرمی سے حکومت و اقتدار تو کیا ساری کائنات لرز جاتی ہے۔

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو — تھرتھراتا ہے جہان چار سو ورنگ و بو
ضربت پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش — حاکمیت کا بُت سنگین دل و آئینہ رو

غرض کہ اقبال کا پیغام پست ہمتوں کے لیے حوصلہ افزا اور جرأت آموز پیغام بنا جس نے ہندوستان کی آزادی میں سب سے اول اور سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اقبال کا کام ہندوستان کی آزادی تک ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ان کا یہ آفاقی اعلان سارے عالم کے لیے ایک پیغام ہے جو دنیا کے ہر گوشے کے محکوم و مظلوم کے لیے نوید حریت و حیات ہے۔ جس سے ساری دنیا کے غریب اور مزدور ہمیشہ تازگی، فرحت اور امید و حوصلہ حاصل کرتے رہیں گے اور اقبال کے انقلابی خیالات ہر غلام ملک اور غلام قوم کے لیے حریت و آزادی کا مژدہ جانفزا بنے رہیں گے۔

☆☆☆

فن اور شخصیت کے آئینہ میں: ڈاکٹر اقبال

'شخصیت' جسم و جثہ، لباس اور بول چال سے عبارت ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال کی شخصیت بڑی جامع الکمالات تھی نہ صرف ملک و وطن بلکہ دنیا کی معروف اور اثر دار شخصیات میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں مذکورہ شرائط کے علاوہ اقبال کی فنی مہارت اور فنی کمال کو بھی برابر کا دخل حاصل ہے۔ جہاں تک اقبال کی شخصیت کا تعلق ہے وہ گھر اور باہر دونوں میں بالکل متضاد نظر آتی ہے۔ گھر پر وہ نہایت سادہ اور عام انسان کی طرح زندگی بسر کرتے تھے لیکن گھر سے باہر لباس اور وقار کے معاملے میں بے حد محتاط نظر آتے ہیں۔ باہر نکلتے تو صافہ باندھتے اور شلوار قمیص پہنتے یا پھر انگریزی لباس ٹائی کے ساتھ زیب تن فرماتے جو ان کے گورے اور خوبصورت بدن پر زیب دیتا تھا۔ ایک تو گوری رنگت اور پھر اس پر کسرتی گٹھیلا بدن، ورزش نے اس کو نہایت سڈول اور مضبوط بنا دیا تھا۔ ایسے جسم پر پُر تکلف لباس اور بھی جچتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال اس قدر دلچسپ اور جاذب نظر شخص تھے کہ احباب اور دوسرے حلقوں میں ممتاز دکھائی دیتے تھے۔ اس پر مذکورہ اہتمام اقبال کی شخصیت میں یک گونہ اضافہ کر دیتا تھا۔ گھر پر جس سادگی اور عام زندگی کا مظاہرہ ہوتا تھا اس کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک بار ترکی کے کرنل ان سے ملنے آئے تو کہنے لگے ہم تو سمجھے تھے اقبال کوئی مولوی یا بزرگ شخص ہوں گے، جن کے چہرے پر نورانی داڑھی، کمر جھکی ہوئی اور ہاتھ میں عصا ہوگا۔ لیکن یہاں آکر محسوس ہوا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اقبال نے برجستہ جواب دیا کہ میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ ترکی کے کرنل کوئی لحیم شحیم آدمی ہوں گے۔ مگر آپ تو نہایت نحیف وضعیف آدمی نکلے۔ اس طرح باہر اور گھر دونوں جگہ اقبال کی شخصیت مرعوب کُن رہتی تھی۔ اپنی گفتگو، شگفتہ مزاجی اور تشفی بخش جوابات سے لوگوں کے دل میں گھر کر لیتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ اقبال ہم نشینوں میں شاعر کی حیثیت سے کم اپنے انداز گفتگو سے زیادہ موثر اور باوقار شخص ثابت ہوئے تھے۔ عبدالمجید سالک نے تو اقبال کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اقبال کی

شہرت ان کے کلام سے کم اور اس بات سے زیادہ ہوئی ہے کہ وہ ایک بہترین Conversationalist تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اقبال کے عہد کے بڑے بڑے عالم اقبال سے ملنے آتے اور اقبال کا غیر فانی اثر لے کر جاتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہ نے اقبال کی جناب میں حاضری دی اور ان کے خیالات سے استفادہ کیا۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک سے بہت سے وفود اقبال سے ملنے آتے رہتے تھے اور اقبال اپنی گفتگو سے ان سب کو مطمئن کرتے رہتے تھے۔ یہ بھی اقبال کی شخصیت کا نہایت اہم اور قابل غور پہلو ہے جس نے اقبال کی ہر دلعزیزی میں اضافہ کیا اور انھیں اعلیٰ دماغ طبقے میں مقبول بنایا۔ دوستوں کے حلقے میں اقبال بے حد چلبلے بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج شخص تھے۔ چودھری شہاب الدین اقبال کے خاص حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ بار کونسل میں ان سے اکثر ملاقات رہا کرتی تھی۔ اقبال کا کہنا تھا کہ چودھری صاحب کو دیکھ کر انھیں اکثر لطیفہ گوئی سوجھتی ہے۔ چنانچہ ایک بار ایسا ہوا کہ ایک محفل میں ایک نواب صاحب سے دوستوں کا تعارف کرا رہے تھے۔ چودھری غلام رسول اس وقت لاہور کے صدر بلدیہ تھے جو ایک بلدیاتی منصب تھا۔ نواب صاحب سے تعارف کرایا تو بولے:

''یہ چودھری شہاب الدین ہیں کہ مہتر لاہور ہیں۔''

مہتر لاہور کی ترکیب پر سارا مجمع قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ عام زندگی میں اقبال ایک چنچل شخص کی طرح نظر آتے ہیں لیکن لاہور سے باہر نہایت سنجیدہ طبع اور مفکر دکھائی دیتے ہیں۔ جب انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے تو انھوں نے پرسنل اسسٹنٹ ایک لیڈی کو بنایا۔ جہاز پر سوار ہوئے تو اسے بلا کر کہنے لگے: ''سفر میں آپ مجھ سے بات نہیں کریں گی'' اور پورے سفر بھر اس سے بات چیت نہیں کی۔ آخر میں وہ بولی: ''آپ مجھے انسان نہیں ایک فرشتہ دکھائی دیتے ہیں۔'' یہ اقبال کی شخصیت کی چھاپ تھی۔ لاہور کے کوٹھوں پر طوائف کے گانے سننے والا اقبال صنف نازک کے معاملے میں کس قدر محتاط تھا اس کا اندازہ تو وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں اقبال کی صحبتوں سے پالا پڑا ہو۔ اس طرح شخصیت کے لحاظ سے اقبال ایک تلون مزاج شخص نظر آتے ہیں۔ اپنی نظم عشق پر عاشق ہرجائی میں تحریر کرتے ہیں ؎

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو
رونقِ ہنگامہ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے

حسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لیے
پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب
اے تلون کیش تو مشہور بھی رسوا بھی ہے

اب جہاں تک اقبال کے فن کا تعلق ہے اقبال فن کے قائل اور اعلیٰ فنکار کے مداح بھی ہیں لیکن اپنی فنکاری کا اعتراف نہیں کرتے۔ انھوں نے ازراہ انکسار اپنے فنی کمال کی یکسر نفی کی ہے اور فن سے لاتعلقی کا اظہار بھی کیا ہے۔ انھوں نے بار بار یہ بات جتائی کہ اقبال فنِ شعر سے ناواقف ہیں اور انھیں شعر کی فنی خوبیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن اقبال کے کلام اور کمال پر نظر ڈالیں تو وہ ایک مشاق فنکار کی حیثیت سے نظر آتے ہیں ان کی شاعری میں فنی کمالات کو سمونے اور آزمانے کی محنت کا سراغ ملتا ہے۔ اشعار کے مطالعے سے جابجا یہ احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ ایسا کلام جو عروض و بلاغت کی رو سے عمدہ نمونہ ہے کسی کہنہ مشق شاعر کا ہی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے شعر گوئی سے اقبال نے اپنی نظموں میں خیالات کی ندرت کے علاوہ جو بھاری فارسی ترکیبیں استعمال کیں وہ ان کی فنکاری کی دھاک جمانے کے لیے کافی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اقبال ایک کلاسیکی مزاج کے شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ جہاں تک فن شعر کے اصول وضوابط کا تعلق ہے وہ بھی بحیثیت مجموعی اقبال کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ بحر و وزن، ردیف و قافیہ وغیرہ کی پابندی اقبال کی فنی چابک دستی کی نمایاں دلیلیں ہیں۔ قافیے تو اکثر نہایت ادق اور مشکل استعمال کرتے ہیں جو کسی ناواقفِ فن سے ہرگز ممکن نہیں۔

اقبال شعر گوئی کی مشرقی روایات کے پابند ہیں۔ ان کے کلام میں غزل، قطع، رباعیات، مثنوی، مخمس، مسدس، ترکیب بند اور ترجیع بند مشرقی اصناف سخن کے سبھی نمونے مل جاتے ہیں۔ خیالات انگریزی مگر ترکیبیں فارسی ہوتی ہیں۔ جو اقبال کی فارسی دانی اور مشرق کے فنی اصولوں کی غمازی کرتی ہیں۔ بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک اقبال کی نظم گوئی میں یہی التزام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جس کی مثال میں نمونے پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ یہاں پر یہ بات ضرور عرض کردینے کی ہے کہ اقبال کے بھاری بھرکم الفاظ نہایت فصیح اور بلیغ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے بوجھل پن، نامانوس یا غیر فصیح ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی سنگ رہ سے گان بجتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراق دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

فراز کوہ، کوثر و تسنیم، شاہد فطرت، سنگ رہ، عراق دلنشیں وغیرہ فارسی بندشیں ہیں جو اقبال کی شعری صناعی میں مزید حسن کاری کا اضافہ کررہی ہیں۔ اس کے علاوہ روح رواں جہاں، دلِ صد چاک بلبل اور فصیل کشور ہندوستان جیسی سہ لفظی ترکیبوں کا ایک خاص اہتمام جاری رہتا ہے۔ مثلاً

مگر یہ حرفِ شیریں ترجمان تیرا ہے یا میرا

....

مگر غنچوں کی صورت ہو دلِ درد آشنا پیدا

....

اثر یہ بھی ہے اک میرے جنون فتنہ ساماں کا

....

وغیرہ میں حرف شیریں ترجمان، دل درد آشنا اور جنوں فتنہ ساماں وغیرہ میں اقبال کے سہ لفظی استعمال کا ایک خاص اسلوب اور ایک خاص انداز ہے جو اردو شاعری میں کمیاب ہے۔ اسے بھی اقبال کی فنی چابک دستی سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس فارسیت کے غلبے کے باوجود اقبال کے کلام میں ایسی آمد اور روانی ہے کہ اس کی حدین موسقیت سے جاملتی ہیں اور ان کی شاعرانہ مشاقی کو بے نقاب کردیتی ہے۔

اقبال کی شخصیت ایک پیغام رساں شاعر کی ہے۔ اس معاملے میں سبھی ہم رائے ہیں کہ ان کی شاعری بنی نوعِ انسان کے نام ایک پیغام ہے۔ اپنی فکر اور فلسفے کے ذریعے وہ قوم کے تن بے جاں میں بیداری کی روح پھونک دیتے ہیں۔ اقبال کی شخصیت کا یہ پہلو اگر چہ براہ راست اقبال کی فکر سے وابستہ ہے لیکن ذرا غور سے دیکھیں تو اقبال کی شخصیت کے اس پہلو کی جھلک ان کے فنی اسلوب پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے اور وہ اپنی شاعری میں اکثر تخاطب کا انداز اختیار کرتے ہیں اور عام طور پر کسی کو مخاطب کر کے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس

میں کسی جان دار یا بے جان کی قید نہیں۔ اقبال کے تمام اردو کلام سے قطع نظر اگر صرف بانگ درا ہی کو پیش نظر رکھیں تو بہت سی نظمیں اسی اسلوب اور اسی اصول کی پابند نظر آئیں گی۔

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں!

اے گل رنگیں! ترے پہلو میں شاید بد دل نہیں

اے آفتاب روح رواں جہاں ہے تو

اے درد عشق ہے گہر آبدار تو

سچ کہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے

وغیرہ بہت سی نظموں کا آغاز ہی صرف ''اے'' سے ہوتا ہے اور پوری پوری نظموں میں تخاطب کا انداز پایا جاتا ہے۔ یہ اقبال کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو ہے جو ان کی فکر اور ان کے فن دونوں پر براہ راست اثر انداہوا ہے۔

اقبال کے مذکورہ انداز میں مشرقی بیداری کا مقصد پوشیدہ ہے لیکن اس مشرقی بیداری کے ساتھ جو دوسرا ذیلی مقصد سامنے آتا ہے وہ مغرب بیزاری کا ہے۔ اقبال کو معلوم تھا کہ اہل مغرب کے علم وحکمت نے ان کی قوم کی نگاہوں کو خیرہ کردیا ہے اس لیے اس خیرہ کن حملے کو روکنے کے لیے ''مغربی تہذیب کے مضرت رساں پہلوؤں پر حکیمانہ انداز میں تنقید کی جائے۔'' تاکہ قوم ان کے خیالات کو ان کے پیغام کو حالی کے کلام کی طرح احتراماً سن کر ٹال نہ دے اور نہ اکبر کی شاعری کی طرح طنز ومزاح سمجھ کر ہنسی میں اڑا دے بلکہ قوم ان کے کلام کو پڑھے سمجھے، غور کرے اور اس سے کوئی نتیجہ برآمد کرے۔ اقبال کے اس حکیمانہ اسلوب کا تعلق جہاں ان کے خاص مقاصد میں سے تھا وہیں اس کا تعلق اقبال کی شخصیت سے بھی تھا۔ فلسفہ تو اقبال کے آب وگل میں رچ بس گیا تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ حیات وفطرت کے وہ معمولی مظاہر جو عام آدمی کی نظر میں اہمیت نہیں رکھتے، اقبال کے لیے غور وفکر کا سامان مہیا کردیتے ہیں۔ بانگ درا کی متعدد نظمیں ان چھوٹے چھوٹے معمولی معمولی مظاہر کو لے کر لکھی گئی ہیں اور ان سے ایک منظم فکر اور فلسفہ اخذ کیا گیا ہے۔ بانگ درا میں گل رنگیں آفتاب صبح، چاند، کنار راوی، ستارہ، طفل شیر خوار، موٹر اور انسان اور بزم قدرت وغیرہ اسی شعری اسلوب نگارش کا نمونہ ہیں۔ یہ اسلوب اقبال کا ذاتی اختیار کردہ ہے جس کی اختراع اور اختیار دونوں پر انھیں قدرت حاصل ہے جس کا تعلق اقبال کے فن ور شخصیت دونوں سے ہے۔

امیجری کا تعلق تخلیق کار کے فن اور فکر دونوں سے ہے۔ جو خیالات ذہن نشین ہوتے ہیں وہ پردہ خیال کے علاوہ صفحۂ قرطاس پر بھی اتر آتے ہیں۔ باکمال فنکار کا یہی کمال ہے کہ وہ اپنے ذہن کو دوسروں کے ذہن تک پہنچا دے۔ فنی اعتبار سے اقبال کی امیجری کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اقبال ایک بے مثال پیکر نگار شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں مکالماتی انداز میں، میں اور تو کی تکرار، مظاہر فطرت کے خوبصورت نمونے اردو فارسی اور مغربی تہذیب کی دلکش تصویریں نظر آتی ہیں جو کلام اقبال کو ایک جاذب نظر مرقع بنا دیتی ہیں۔ شاعر اپنا خیال ظاہر کرتا ہے اور قاری کے سامنے اس کا نقشہ ایک فلم کے پردے کی طرح کھنچ جاتا ہے۔ ہمالہ ہی سے لیجیے ؎

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے جھک کے پیشانی کو تیری آسماں

پڑھتے ہی فرط محبت میں آسماں کا جھک کر پیشانی کا بوسہ لیتا دکھائی دینے لگتا ہے۔ فطرت کی منظر نگاری کی ایک اور مثال سنیے ؎

لیلیٔ شب کھولتی ہے آکے جب زلف رسا — دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوش نما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

یہ تو ظاہری دکھائی دینے والی چیزیں تھیں۔ اقبال نے باطنی اور نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو بھی اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ مرئی پیکر کی شکل میں سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً خودی جو نہ دکھائی دینے والی شے ہے، وہ بھی دکھائی دینے والی چیزوں کی طرح سامنے نظر آنے لگتی ہے اور Personification کی عمدہ مثال قائم ہو جاتی ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

....

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

یہ ہے اقبال کی شخصیت اور فنکاری، ان کا ذہن، زبان، حسن ادا، اسلوب نگارش اور فنی ملکہ جس نے اقبال کے کلام کو انتہائی مترنم، خوش آہنگ، مسرت آفریں، ولولہ انگیز اور پُر تاثیر بنا دیا ہے۔ جس طرح اقبال روشن دماغ اور بلند خیال شخص ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین خوش نویس بھی تھے اسی طرح وہ اعلیٰ مفکر اور فلسفی ہونے کے ساتھ بہترین فنکار بھی تھے۔ جس کی تعمیر میں مشرقی روایات، بالخصوص ہندوستانی تاثرات کو بے حد دخل حاصل ہے۔

☆☆☆

اقبال اور سنسکرت

اقبال فلسفہ کے طالب علم تھے۔ اس واسطے اسلامی و مغربی فلسفہ کے ساتھ ساتھ ہندی فلسفے سے واقف ہونا بھی ان کے لیے ضروری تھا جو قدیم ہندی تہذیب کی زبان سنسکرت کے جانے بغیر ناممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال عربی، فارسی، انگریزی کے ساتھ ساتھ سنسکرت ادب پر بھی برابر کی دسترس رکھتے تھے۔ لندن میں عطیہ نے اقبال سے پہلی بار ملاقات پر لکھا ہے کہ ''میں نے انھیں بہت ہی فاضل شخص پایا۔ عربی، فارسی، سنسکرت سب بخوبی جانتے ہیں۔'' اقبال کے خطوط، مضامین اور اشعار کا مطالعہ نہ صرف اس بات کا غماز ہے کہ اقبال سنسکرت داں تھے بلکہ اس امر کی پرزور تائید کرتے ہیں کہ اقبال کی سنسکرت ادب پر گہری نظر تھی اور ان کو سنسکرت زبان پر عبور حاصل تھا۔ اقبال کی اوائل شعر گوئی میں پائی جانے والی نظم ''آفتاب'' اس تائید کی مدعی ہے کہ اقبال کی سنسکرت علوم پر زبردست گرفت تھی۔ وہ زبان کے صوتی آہنگ، تعمق معانی اور قواعد کے مختلف رموز سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس نظم میں اقبال فن ترجمہ کے جن دشوار مراحل سے گزرے اس کا اندازہ بھی اقبال کے مختلف سنسکرت الفاظ ''سوتر'' اور ''دیوتا'' وغیرہ کے اردو تراجم سے ہوتا ہے۔ سنسکرت لفظ ''سوتر'' کی ترجمانی اقبال نے لفظ ''آفتاب'' سے کی ہے لیکن ساتھ ہی اردو اور فارسی زبان کی کم مائیگی اور کم عیاری کا اعتراف بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ اردو زبان میں اس لفظ کا کوئی مترادف نہ مل سکا، جس کی وجہ سے اصل لفظ ''سوتر'' کی جگہ ''آفتاب'' استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح معلوم ہوا کہ اقبال سنسکرت الفاظ کی گہرائی کی تہہ کو پہنچے ہوئے تھے۔ لسانی اعتبار سے الفاظ کی جو معنوی اور صوری اہمیت ہوتی ہے ان دونوں پر اقبال کی نظر یکساں تھی۔ ویدوں کے منتر کا ترجمہ اور وہ بھی منظوم، نیز ترجمہ اس کے معانی کی روح کو پیوست کر کے کر دینا اقبال کی علمی لیاقت اور سنسکرت دانی کا بین ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ نظم ''آفتاب'' کے مفہوم کی وضاحت کے لیے اقبال نے اس نظم کے ساتھ شذرۂ تمہیدی بھی تحریر کیا جو رسالہ مخزن ماہ اگست ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ گایتری منتر پر

نوٹ لکھتے ہوئے اقبال نے لکھا تھا:

''ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری منتر کہتے ہیں۔ یہ دعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا ان تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظام عالم کے حیرت ناک مظاہرہ کے مشاہدہ سے اول اول انسان ضعیف البیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔ اس قسم کی تحریروں کا مطالعہ علمِ ملل والنحل کے عالموں کے لیے انتہا درجہ کا ضروری ہے کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کے ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ محققین السنۂ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونز کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں اس کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ سنسکرت زبان کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنہ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ ''سوتر'' استعمال کیا گیا ہے، جس کے لیے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ ''آفتاب'' رکھا ہے لیکن اصل میں اس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی ''آفتاب'' کسب ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے نیز صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے:

اللہ نور السمٰوات والارض اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔ علیٰ ہٰذا القیاس افلاطون الٰہی کے مصری پیروؤں اور ایران قدیم کے انبیاء کا بھی یہی مذہب تھا۔

ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں یہ دقت اور بھی بڑھ گئی کیونکہ اصل الفاظ کی آواز کی موسیقیت اور وہ بھی طمانیت آمیز اثر

جوان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے۔ اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گایتری نے مصنف کے ملک الشعراء ٹنی سن مرحوم کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن میں حروف علّت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمے کی بنیاد اس سوکت (گفتار زیبا) پر رکھی ہے جس کو سوریا نرائن اپنشد میں گاتیری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے۔ ترجمہ کرنے کو تو میں نے کر دیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قائم کریں گے جو چیپ مین نے پوپ کا ترجمہ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی، یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن گایتری نہیں ہیں۔''

ترجمہ کے دوران سنسکرت زبان کی نحوی پیچیدگیوں کی طرف اشارہ اور گایتری کے اصوات و آہنگ کی موسیقیت کا کسی دوسری زبان میں منتقل کیا جانا ناممکن سمجھنا وغیرہ ایسے حقائق ہیں جو سنسکرت سے پوری واقفیت کا پتہ دیتے ہیں۔

گایتری کے اس ترجمہ کے ذیل میں اقبال نے ایک اور اہم نکتہ بیان کیا ہے۔ انھوں نے ''دیوتا'' اور اس سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار حیرت انگیز طور پر کیا ہے۔ ایک شعر ہے ؎

ہر چیز کی خیات کا پروردگار تو
زائیدگان نور کا ہے تاجدار تو

یہاں زائیدگان نور پر نوٹ اس طرح لکھا ہے۔

''سنسکرت میں لفظ ''دیوتا'' کے معنی زائیدہ نور کے ہیں۔ یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے، ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا جس کو ہم لفظ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانا میرے نزدیک صحیح معلوم نہیں ہوتا۔'' (باقیاتِ اقبال ص ۴۳)

اسی قسم کے خیال کا اظہار اقبال نے اپنی نظم ''زہد و رندی'' میں بھی کیا ہے یہ خیال

ایک مولوی صاحب کی زبانی اقبال کے متعلق نظم کیا گیا ہے۔

سنتا ہوں کہ مشرک نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی

گویا بقول مولوی صاحب کے فلسفہ پڑھنے کی وجہ سے اقبال نے ہندو کو کافر نہیں سمجھا جن کے لیے اقبال نے ہندی فلسفہ کی خاک چھانی اور اس کے پیچ وخم سے قابل قدر آگاہی بھی حاصل کی۔ سنسکرت تہذیب کے یہ اثرات اقبال کی نظم ''نیا شوالہ'' میں اوج کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ یہاں تو سنسکرت تہذیبی پیکروں کا وہ سلسلہ قائم ہوگیا ہے جہاں کسی مندر میں تلک دھاری پجاری مورتوں کے آگے پوجا میں مگن ہو۔ صنم آشنائی اور دیر پسندی کا یہ نمونہ ذیل کے اشعار میں قابل غور ہے۔

پھر ایک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو
اس ہردوار دل میں لاکر اسے بٹھا دیں
زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شان حرم دکھا دیں
پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا
ہر آتما میں گویا اک آگ سی لگا دیں
آنکھوں کی ہے جو گنگا لے لے کے اس سے پانی
اس دیوتا کے آگے اک نہر سی چلا دیں
ہندوستان لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو
آوازۂ اذاں کو ناقوس میں بجا دیں
اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا

بانگ درا میں ایک نظم ''سوامی رام تیرتھ'' کے عنوان سے ہے اور اسی نسبت سے ہے کہ سوامی جی فلسفہ ویدانت کے شائق تھے اور رموز توحید سے باخبر تھے۔ عابد علی عابد لکھتے ہیں:

''مشہور ہے کہ وہ ہفتوں دریائے راوی کے کنارے بارہ دری میں محویت کے عالم میں بیٹھے رہتے۔ ۱۹۰۶ء میں جب وہ ہردوار میں تھے تو ایک دن تیرتے ہوئے گنگا میں دور تک نکل گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حالت جذب و مستی میں وہیں نذر آب ہو گئے اور انھوں نے اپنے کو بچانے کی کوشش نہیں کی۔''

سوامی جی کے انھیں افکار کا عکس اس نظم میں بخوبی نمایاں ہے۔ جس کے پس پردہ ویدانتی فلسفہ کی روح بولتی نظر آتی ہے۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے آب تو
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو
آہ کھولا کس ادا سے تو نے راز رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیر امتیاز رنگ و بو
نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

ویدوں کے مطالعہ سے متعلق بہت سے شواہد اقبال کے یہاں پائے جاتے ہیں کہ اقبال ویدوں کے علوم سے بھرپور آگاہی رکھتے تھے۔ جب ابن عربی کی فصوص الحکم کا مطالعہ اقبال نے کیا تو انھیں اس میں شنکر اچاریہ کا ویدانتی فلسفہ نظر آیا اور انھوں نے سراج الدین پال کو لکھا کہ شیخ اکبر کی فصوص الحکم میں الحاد و زندقہ کے علاوہ کچھ اور نظر نہ آیا۔ گویا اقبال نے شنکر اچاریہ کی تصانیف کا بھی بغور مطالعہ کیا تھا جنھوں نے فلسفہ ویدانت کی تفسیر پر خامہ فرسائی کی ہے۔ شنکر اچاریہ نے بدھ مت کے خلاف ویدوں کی تعلیم کو پھیلایا۔ ان کے خیال میں روح (آتما) اور برمھ ایک ہی چیز ہیں جس کا اشارہ شاید اقبال کے مذکورہ مصرعے ''لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا'' میں موجود ہے۔

تلسی داس کا سنسکرت بچن ''اہم برمھ آسمی'' بھی اسی فکر کی آواز ہے جس کو اقبال نے قیام یورپ کے دوران منصور حلاج کی آواز ''انا الحق'' کی صورت میں محسوس کیا اور اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے ''ایران کا مابعد الطبیعاتی ارتقا'' میں اس نکتہ کو واضح کیا۔ اس طرح معلوم ہوا کہ اقبال نے سنسکرت فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ویدانتی فلسفہ کا تذکرہ کرتے ہوئے دیباچۂ اسرار خودی میں لکھا ہے۔

''بنی انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اسی عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترک کلی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے بلکہ ترک عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے متعلق دل بستگی نہ ہو۔ سری کرشن کے بعد سری رامانج بھی اسی راستے پر چلے مگر افسوس ہے کہ جس عروس معنی کو سری کرشن اور سری رامانج بے نقاب کرنا چاہتے تھے سری شنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا۔ سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی۔''

کسی موضوع کے متعلق کوئی فیصلہ کن نتیجہ اخذ کر لینا بغیر وسیع مطالعہ کے ممکن نہیں۔ سری کرشن، سری رامانج اور سری شنکر اچاریہ کے افکار کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ سری کرشن اور سری رامانج کے افکار کو شنکر اچاریہ کے افکار نے گرد آلود کر دیا۔ اقبال نے اپنی گراں مایہ تصنیف ''بال جبریل'' کی ابتدا میں یہ شعر لکھا ہے۔

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم نازک بے اثر

شعر کے نیچے قوسین میں ''بھرتری ہری'' تحریر ہے۔ معلوم ہوا کہ اقبال نے بھرتری ہری کی تصانیف سے بھی استفادہ کیا ہے، جس میں ویدانت کی وقیق تعلیمات کے آثار ملتے ہیں۔ بھرتری ہری قدیم زمانے میں مالوہ کا حکمراں اور وکرمادت کا بھائی بتایا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی عیش و عشرت میں گزری لیکن اپنی بیوی اندسینا کی بے وفائی کا راز جان کر حکومت وکرمادت کو سونپی اور خود ویراگ (ترک دینا) لے کر جنگلوں کی گپھاؤں کو اپنا مسکن بنا

لیا اور مشہور جوگی گورکھ ناتھ کو گرو مان کر اپنے ویراگ کی تکمیل کرنے لگا۔ اُجین میں ابھی تک ایک غار بھرتری ہری گپھا کے نام سے موسوم ہے۔ تیاگ اور تپسّیا کے زمانے میں اس جوگی نے ایک کتاب لکھی جس کا نام شتک تریم رکھا۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ اول حصہ نیتی شتک، دوسرا حصہ شرنگار شتک اور سوئم ویراگ شتک۔ یوسف سلیم چشتی نے مذکور شعر کے ذیل میں لکھا ہے:

> ''یہ شعر راجہ بھرتری ہری کی تصنیف کے پہلے حصے موسومہ نیتی شتک کے چھٹے اشلوک سے ماخوذ و مقتبس ہے۔ پورا اشلوک اس طرح ہے: ''کسی شخص کا اپنے عقلی استدلال کے زور سے کسی مورکھ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرنا ایسا ہی بے سود ہے جیسا کسی شخص کا مست ہاتھی کو کنول کے ڈنٹھل سے روکنا یا شرش کے نازک ریشوں سے ہیرے میں چھید کرنا۔''

بھرتر ہری کے افکار اقبال کو اتنے عزیز ہوئے کہ انھوں نے انھیں سرنامہ کے طور پر استعمال کیا اور یہی وہ قدیم ہندی شاعر ہے جو اقبال کو جاوید نامہ میں ''آں سوئے افلاک'' ملتا ہے اور اپنے دقیق نکات اور خیالات سے نوازتا ہے۔ شاعر مذکور کا ''آں سوئے افلاک'' پایا جانا ہی اس کی عظمت کی نشانی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اس کے کلام کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کے افکار عالیہ کی ترجمانی کر کے اسے اپنے آسمانی سفر میں ایک بلند مقام پر فائز کیا ہے۔

جاوید نامہ کے اس آسمانی سفر کی بالکل ابتداء میں ''فلک قمر'' پر اقبال کی ملاقات سب سے پہلے ایک عارف ہندی ''جہاں دوست'' سے ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اقبال نے مشہور ہندی مہاتما وشوامترا کے نام کا لفظی ترجمہ کر کے لکھا ہے۔ جاوید نامہ کی جوابی حیثیت کہ دانتے کی ڈوائن کومیڈیا کا جواب ہو اور فلک اول (قمر) اور فلک آخر (آں افلاک) دونوں جگہ اقبال کی ملاقات ہندی بزرگوں سے ہو اقبال کے جس ذہنی رویہ کی حامل ہے اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

سنسکرت تہذیب کے کچھ بامعنی علامتی الفاظ بھی اقبال نے اپنے کلام میں بے باکی کے ساتھ استعمال کیے ہیں مثلاً گنگا، شکتی، شانتی، مکتی، پریت، من، موہ، اپدیشک، زنار، مورت، ناقوس، پجاری، دیر اور برہمن وغیرہ جب اقبال اپنے اشعار میں استعمال کرتے ہیں تو

قاری کا ذہن سنسکرت تہذیب کی طرف اس طرح مبذول ہوجاتا ہے کہ تمام مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ ہندوستان کے یہ ثقافتی پیکر اور لفظی تصویریں اقبال کے ذہنی رجحان کی اس سمت کا پتہ دیتے ہیں جس کا تعلق ہندی سنسکرت تہذیب سے ہے۔ برہمن کا پیکر تو اقبال نے اپنے کلام میں بہت زیادہ توجہ کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ یہ وہی برہمن ہے جو ہندی سنسکرت ثقافت کا بنیادی کردار ہے جس کی تخلیق برمھ کے مکھ سے ہوئی ہے اور جسے اقبال اپنے ہندی نژاد ہونے کی بنا پر بڑے فخر سے استعمال کرتے ہیں ۔

میں اصل کا سومناتی۔ آباء مرے لاتی و مناتی

....

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

☆☆☆

اقبال کی شاعری میں برہمن

اقبال نے تاریخ عالم کی ممتاز ہستیوں کا تذکرہ بڑی کثرت سے کیا ہے تاکہ کاروبارِ عالم کے نشیب وفراز اور نظام زندگی کی مختلف کیفیات کو بے نقاب کیا جا سکے۔ انسان اقبال کی شاعری کا نقطۂ خیال ہے جو دنیا میں بہت سی آلائشوں سے گھرا ہوا ہے اور خوب وزشت کی آویزش سے بھی دوچار ہے۔ دنیا میں حسن وقبح کی گوناگوں صورتیں ہیں۔ اقبال ان غیر محسوس صفات کو زیادہ واضح اور روشن کرنے کے لیے اقوام عالم کی نمایاں شخصیات کو سامنے لاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی بڑی خوبی یا کمال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً صداقت اور جاں نثاری کے لیے حسینؓ و اسماعیلؑ، جہل وفساد کے لیے ابوجہل و ابولہب، شاہانہ کروفر کے لیے محمود، نیاز و وفا کے لیے ایاز اور اسی طرح کے اور بہت سے صلحاء اولیاء، علماء، حکماء اور کبراء کو اقبال نے علامت اور اصطلاح کے طور پر پیش کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے متعدد مذہبی پیشواؤں سے بھی خاطر خواہ اخذ واستفادہ کیا ہے۔ مثلاً پیرِ کنشت، پیرِ کلیسا، پیرِ حرم اور پیرِ مے خانہ وغیرہ ہندوستان اور اس کے متعلقات کی غرض سے امام، ملاّ، شیخ اور برہمن وغیرہ مذکور ہوئے ہیں۔ اور یہ سب معاشرہ میں اپنے اپنے دائرے کے بااثر اشخاص تسلیم کیے گئے ہیں۔ گویا ان کی تقلید کرنے والوں کی بہت کچھ کامرانی یا ناکامی انھیں حضرات پر منحصر ہے۔ ان کی خوش اندیشی بیڑہ کو پار بھی لگا سکتی ہے اور ان کی بدآموزی یا ناخوش اندیشی سفینے کو ڈبو بھی سکتی ہے۔ ان کی قیادت سرخرو اور سربلند بھی عطا کر سکتی ہے اور ان کی لغزش قعرِ مذلت میں بھی دھکیل سکتی ہے۔ شیخ و برہمن کا کردار تو اردو شاعری کا دلچسپ موضوع ہے۔ اقبال نے بھی ان کو موضوعِ سخن بنایا لیکن اقبال کے یہاں ان کی ایک ارتقائی شکل دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ مختلف منزلوں سے گذر کر ایک بالکل نئے اور انوکھے مفاہیم اختیار کر لیتی ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ شیخ و برہمن کی تکرار اور واعظِ دیں دار پر لعنتوں کی بوچھار اردو شاعری کا روایتی حصہ ہے۔ ابتدا میں اقبال کی شاعری پر اس روایت پسندی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں

بھی دونوں اصحاب کو اسی انداز سے ہدف ملامت بنایا گیا ہے۔ لیکن اقبال کے فکر و فلسفہ کی طرح جیسے جیسے اقبال کا شعری سفر آگے بڑھتا گیا، ان دونوں اصطلاحوں کے مفاہیم میں بھی تغیر پیدا ہوتا چلا گیا۔ بناوٹی واعظ اور ڈھونگی ملاّ کو تو اقبال نے بہت سخت سست سنائی ہے اور بعد کے زمانے میں تو وہ پہلے سے بھی زیادہ معتوب قرار دیے گئے لیکن برہمن کے نزدیک اقبال کا رویہ نرم تو ہوتا چلا گیا۔ برہمن کی شخصیت کے یہ دونوں رُخ اقبال کی ایک ہی نظم ''شوالہ'' میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ نظم کی ابتدا میں تو برہمن سے کچھ اختلاف ہے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

لیکن اسی نظم کے آئندہ اشعار میں برہمن کے لیے ہمدردانہ اور مخلصانہ رجحان بھی ہے۔ اقبال برہمن کو بلاتے ہیں اور پھر دونوں مل کر ایک نئی صبح اور نئی تعمیر کا منصوبہ بناتے ہیں۔

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

فحوائے کلام سے ظاہر ہے کہ پوری کی پوری نظم برہمن سے خطاب ہے۔ اقبال کی برہمن سے دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ شروع سے آخر تک برہمن ہی موضوع کلام رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اقبال نے نظم کا نام ''نیا شوالہ'' بس رکھ ہی دیا ہے ورنہ اس کا عنوان ''برہمن'' ہونا چاہیے تھا۔ اقبال کی یہ خواہشِ ہمرہی برہمن کے ساتھ ہمدردانہ جذبہ کی مظہر ہے۔ گویا ''نیا شوالہ'' میں برہمن کا وہ کردار جو منافرت اور تفرقہ پردازی کا موجب تھا، اب ہم آہنگی اور یگانگت کا علم بردار بننے لگا ہے۔ نظم میں بھی برہمن کی اسی ادا کی طرف اشارہ ہے اس کی رگِ حمیت کو پھڑکانے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ اس میں غیروں کو اپنانے کا جذبہ بیدار ہو۔

برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

یہ تو رہا اقبال کی اردو شاعری میں برہمن کا تصور، لیکن ان کی فارسی شاعری پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں برہمن کا کردار ایسا نفرت آگیں نہیں ہے جیسا کہ اردو شاعری میں، بلکہ وہ ایک معزز اور باوقار ہستی کا کردار ہے جو صاحبِ عقل وخرد ہے اور غور وفکر میں مستغرق رہنے والا ہے۔ یہاں پر یہ بات بھی عرض کردینے کی ہے کہ اقبال کے فارسی کلام میں

برہمن کا لفظ ان کے اردو کلام کی بہ نسبت زیادہ آیا ہے اور اقبال اس کے مرتبہ اور تقدس کا احترام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جوشِ احترام میں اسے مُحترم کے القاب سے نوازتے ہیں۔ اسرار خودی میں اقبال جب انسانی کمالات کی بلندیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ایک ایسے شخص کی تعریف بھی کرتے ہیں جو گیان دھیان میں مگن ہے۔ گوشۂ تنہائی میں مقیم ہے۔ حکایت شیخ و برہمن میں شیخِ کامل کی زبان سے اس ذی فہم اور ذی وقار انسان کی تعریف ان کلمات میں کرتے ہیں۔

در بنارس برہمند محترم
سرفرو اندریم بود و عدم
بہرۂ وافرز حکمت داشتے
با خدا جویاں ارادت داشتے
ذہن او رگیرا و حکمت کوش بود
با ثریا عقل او ہمدوش بود
آشیانش صورت عنقا بلند
مہرومہ بر شعلہ فکرش سپند

(ص۔۵۹)

اس حکایت میں برہمن کی بارگاہ میں جو مادبانہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان ہی سے اقبال کی سپاس گذاری کا نشان ملتا ہے۔ یہاں پر اس کو امانت دارِ تہذیب کہن کہا گیا ہے اور اس کو بت پرستی سے گریز کے بدلے اپنی کافری میں پختہ اور "شائستہ زنار" ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اور سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ برہمن کے کفر کو بھی سرمایۂ جمعیت قرار دیا گیا ہے۔

من نہ گریم از بتاں بیزار شو
کافری شائستہ زنار شو
اے امانت دار تہذیب کہن
پشت پا بر مسلکِ آباء مزن
گر ز جمعیت حیات ملت است
کفر ہم سرمایۂ جمعیت است

تو کہ ہم درکافری کامل نہ
در خور طرفِ حریم دل نہ

(ص ۵۹)

اتنا ہی نہیں، برہمن کی دانش و بینش کا اعتراف بھی کیا گیا ہے اور وہ بھی معمولی طور پر نہیں بلکہ کچھ اس طرح کہ نہ صرف بیباک اور راز جو ہے بلکہ پیکر علم و ہنر بھی اور اتنا غیرت آفریں ہے کہ غزنوی جیسا اولوالعزم بادشاہ بھی اس کے سامنے محو حیرت رہ جاتا ہے۔

برمنے بہ غزنوی گفت کرامتم نگر
تو کہ صنم شکستۂ بندہ شدی ایاز را

(ص ۹۷۹)

(ایک برہمن نے غزنوی سے کہا کہ میری کرامت کو دیکھ تو نے بُت تو توڑ دیے مگر بُتِ ایاز کی بندگی اختیار کرلی ہے۔)

چونکہ برہمن صاحب ہنر اور صاحب عمل ہے اس لیے غافل دیندار اور شیخ بے کردار سے بدر جہا بہتر ہے بلکہ بعض اوقات ان کے لیے عملی نمونہ اور قابلِ تقلید بھی ہے کیونکہ قوت عمل سے سرشار ہے اس لیے کچھ نہ کچھ کرنے کا عادی ہے۔ اور اقبال کی نظروں میں ہر وہ شخص محبوب ہے جو جہد و عمل کا پیکر ہے۔ برہمن اس لیے بے حد محبوب اور مثالی نمونہ ہے کہ وہ ہر وقت مصروفِ عمل رہتا ہے۔ خواہ طاق میں بتوں کو سجائے۔ پتھر کاٹ کر صنم تراشے، منتر دہرائے، آرتی اتارے، جل چڑھائے یا ڈنڈوت کرے وہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو مصروفِ کار رکھتا ہے۔ وہ فعال اور متحرک ہے اور بے عملی اور بے خبری کی زندگی سے پاک ہے۔

برہمن رانگویم ہیچ کارہ
کند سنگ، گراں را پارہ پارہ
نیاید جزبہ زورِ دست و بازو
خدائے را تراشیدن زخارہ

(ص ۹۷۹)

(میں برہمن کو ناکارہ نہیں کہتا۔ وہ تو بھاری پتھروں کو ریزہ ریزہ کرتا ہے۔ بغیر دست و بازو کی طاقت کے خدا کو بھی پتھر سے نہیں تراشا جاسکتا۔)

برہمن کی ایک صنف یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کا دست نگر نہیں ہے۔ اس کے کاندھے پر پڑا زنار اس بات کی علامت ہے کہ وہ کسی غیر کا بارِ دوش نہیں ہے بلکہ اپنا بوجھ خود اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ خود کفیل ہے اور خود شناس بھی ہے اور یہ اقبال کی تعلیمات کا اہم جز ہے۔ اپنے کاموں کی خود نگہبانی اقبال کی خودی کا درس اولین ہے۔ اس طرح اقبال کو برہمن کے کردار میں خامیاں کم اور خوبیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ ذیل کی رباعی میں برہمن کا خوددار اور خود کار پیکر ملاحظہ کریں۔

نگہ دارد برہمن کار خود را
نمی گوید بہ کس اسرار خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر
بدوش خود برد زنار خود را

(ص ۹۷۹)

(برہمن اپنے کام کی خود دیکھ بھال کرتا ہے اور کسی سے اپنے راز کو نہیں کہتا۔ مجھ سے کہتا ہے کہ تسبیح کو چھوڑ وہ تو اپنے زنار کو خود اپنے کندھے پر لے جاتا ہے۔)

برہمن اس قدر دانا اور خردمند ہے کہ وہ نہ صرف انسانوں کو ہوش و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے بلکہ بعض اوقات تو یزداں کو بھی عقل و حکمت کی باتیں بتا جاتا ہے۔ وہ اپنے مجرب دلائل سے ثابت کرتا ہے کہ میرا تخلیقی عمل تیرے تخلیقی عمل سے کہیں زیادہ پائیدار ہے۔ پیامِ مشرق میں لالہ طور کی ایک رباعی ملاحظہ کریں۔

بہ یزداں روز محشر برہمن گفت
فروغِ زندگی تاب و شرر بود
و لیکن گر نرنجی با تو گویم
صنم از آدمی پائندہ تر بود

(ص ۲۰۰)

(حشر کے روز برہمن نے خدا سے کہا کہ زندگی کا فروغ بس اک چمک تھا۔ اگر تو ناراض نہ ہو تو ایک بات کہوں۔ پتھر کی مورت آدمی سے زیادہ پائیدار تھی۔)

اس طرح اقبال نے برہمن کو فلسفۂ جبر و قدر کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا اور برہمن

کی گستاخی اور دلالت سے اسے نہ صرف روشن بصر بنادیا بلکہ کمال صفتِ یزدانی کے مقام پر پہنچادیا ہے۔ ظاہر ہے کہ برہمن کو یہ مقام بلند عطا کرنا اقبال کا روایت سے یکسر انحراف ہے۔ بعض مقامات پر تو اقبال نے برہمن کو عافیت خیز اور بعض معاملات میں اس کو خدائی صفات کا مرتکب قرار دیا گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اس کے جبر و اصرار سے نالاں ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس نے وہ خواہش ظاہر کی ہے جو خدا نے روز ازل ظاہر کی تھی۔ اس طرح اس کے عمل میں خدائی عمل کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔

عصر حاضر میں ہندوتو کے بڑھتے ہوئے رجحان ہندی، ہندو، ہندوستان اور بابری مسجد کے انہدام کے تناظر میں یہ رباعی پڑھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زخم پر پھایا رکھ دیا۔

مرنج از برہمن اے واعظ شہر
گراز ما سجدۂ پیش بتاں خواست
خدائے ماکہ خود صورت گری کرد
بتے راسجدۂ از قدسیاں خواست

(ص ۲۵۴)

(اگر اس نے ہم سے ایک سجدہ چاہا تو اے واعظ شہر برہمن سے رنجیدہ مت ہو کیونکہ ہمارے خدا نے جس نے خود اپنے ہاتھ سے صورت بنائی اس نے بھی فرشتوں سے ایک بت کو سجدہ کی فرمائش کی تھی۔)

یہاں اقبال نے برہمن کی متزاد فکر کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے جس سے دلوں کے درمیان کی خلیج کو پاٹا جاسکے۔ برہمنیت کا یہ احترام و التزام خالی از علت نہیں برہمن کی تعریف و توصیف کرتے کرتے اقبال اتنا آگے گزر جاتے ہیں کہ گمان ہونے لگتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اقبال کو خود اپنی برہمن زادگی یاد آگئی ہو اور فخر و مباہات کی رو میں اس منزل تک پہنچ گئے ہوں گے کہ انھیں پورے ہندوستان میں برہمن سے بڑھ کر کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا۔ وہ پورے ہندوستان میں نظر ڈالتے ہیں، تو واحد صاحب اسرار اور یکہ و تنہا رمزشناس کو دیکھ پاتے ہیں اور اس شخص کو اہل پاتے ہیں جو برہمنوں کی نسل سے ہے برہمن زادہ ہے۔

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

(ص ۴۰۵)

(مجھ کو دیکھو کہ ہندوستان میں کوئی دوسرا نہیں ملے گا۔ ایک برہمن زادہ روم اور تبریز کے رموز سے آگاہ ہے۔)

ہندو اساطیر کے مطابق برہمنوں کا تعلق ذکاوت و ذہانت سے ہے۔ وہ اعلیٰ دماغ کے حامل ہیں کیونکہ ان کی سرشت برہم کے مکھ سے ہوئی ہے۔ اس لیے انھیں سماج کے تمام طبقوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اقبال بھی کشمیری پنڈت تھے اور برہمیت پر نازاں بھی تھے۔ انھوں نے نسلاً اعلیٰ دماغ اور دانشور ذہن وراثت میں پایا تھا جو پنڈتوں کا سرمایۂ افتخار ہے۔ ذہنی اپج اور طباعی تو پنڈتوں کا ازلی شیوہ ہے۔ اقبال بھی بعض اوقات تو اپنی برہمیت پر اس قدر فخر کرتے ہوئے محسوس ہوئے ہیں کہ یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ کہیں اقبال کی برہمیت تو عود نہیں کر آئی؟ مانو شاعر جذبۂ پرستش سے اس قدر سرشار ہے کہ بت تراشی اور صنم پرستی میں محو ہو گیا ہے۔

تراشیدم صنم برصورت خویش
بہ شکل خود خدارا نقش بستم
مرا از خود بروں رفتن محال است
بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

(ص ۹۳۸)

(میں نے اپنی شکل پر بت بنایا ہے اور اپنی شکل پر خدا کا نقشہ کھینچا ہے۔ میرا خود اپنے آپ سے نکلنا مشکل ہے۔ میں ہر صورت میں خود پرست ہوں۔)

عالمِ محویت کے اس شوق میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں کعبہ اور بت خانہ کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ دیر و حرم دونوں مشہد گاہِ جلوۂ جانانہ نظر آنے لگتے ہیں۔

فرقے نہ نہد عاشق در کعبہ و بت خانہ
ایں جلوت جانانہ آں خلوت جانانہ

(ص ۳۳۵)

(عاشق کعبہ اور بت خانہ میں فرق نہیں رکھتا۔ یہ محبوب کا جلوہ خانہ ہے اور وہ محبوب کا خلوت خانہ۔)

یہی نہیں کہ دونوں ایک ہی ذات مطلق کے مظہر بن گئے ہیں بلکہ ایک طرح سے حرم پر بت خانہ کو فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔ بت خانہ شاعر کی نگاہ میں اتنا عظیم اور دقیع قرار پایا کہ زندگی تو کیا بعد وفات بھی شاعر اپنی لحد میں حرم سے بت خانہ کی جانب پلکوں سے راہ کھودنے پر آمادہ ہے۔ یہ عجیب وغریب کیفیت ہے جو نیازمندان اقبال کے لیے خاصی پریشان کن ہوگی اور جو عقل اور روح دونوں کو ہلا دینے والی ہے۔ لیکن شاید اس کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔

شادم کہ مزار من در کوئے حرم بستند
راہے زمژہ کاوم از کعبہ بہ بت خانہ

(ص ۳۳۵)

(میں خوش ہوں کہ انھوں نے میرا مزار کوچۂ حرم میں بنایا ہے لیکن میں اپنی پلکوں سے کعبہ سے بت خانہ کی طرف راستہ کھود رہا ہوں۔)

ممکن ہے یہ وہی خیال ہو جس کے متعلق اقبال نے پیام مشرق کے دیباچہ میں تحریر کیا تھا:

''اس وقت نیا اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و قوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید وتولید ہو، قابلِ احترام ہے۔''

(ص ۱۸۲)

اقبال کے یہاں برہمن کی تعظیم وتکریم کا یہ عالم ہے کہ اقبال اس کو کافر تو کیا مشرک بھی گردانے کو تیار نہیں۔ اپنی نظم آفتاب کے دیباچہ میں ایک جگہ زائیدگان نور کے تحت بحث کرتے ہوئے نوٹ لکھتے ہیں:

''سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدگانِ نور کے ہیں یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوق کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً ان کا مفہوم وہی ہوگا جس

کو ہم لفظِ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانا میرے نزدیک صحیح معلوم نہیں ہوتا۔''

(باقیات اقبال ص ۴۴)

اقبال کے نزدیک برہمن کافر نہیں بلکہ کافر وہ ہے جو ہنرمندی سے خالی ہے۔ تخلیقی قوتوں سے عاری ہے گویا برہمن اس لیے کافر نہیں کہ وہ تخلیقی صلاحیت رکھتا ہے اپنی محنت اور کاریگری سے سنگ تراشی کرتا اور خوبصورت پیکر ڈھالتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اس کا عمل اور جدوجہد ہی یقین کی علامت ہے۔ کافر تو وہ ہے جو بے ہنر ہے اور قوتِ تخلیق سے معرّیٰ ہے۔

ہر کہ او را قوت تخلیق نیست
پیش ماجز کافر و زندیق نیست

(جاوید نامہ ص ۱۷۷)

(وہ ہر شخص جو قوتِ تخلیق نہیں رکھتا میرے نزدیک کافر و زندیق کے سوا کچھ نہیں۔)

تخلیقی عمل خدا کی سب سے نمایاں صفت ہے پھر عملِ تخلیق سے نابلد خالقِ کائنات کا نائب کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لیے اگر اسے صحیح معنوں میں اپنی نیانت کا حق ادا کرتا ہے تو تخلیقی جوہر کو بروئے کار لانا ہوگا۔ اور خیال آفریں بلکہ حیات آفریں بن کر دکھانا ہوگا۔ ہمارے ناقص خیال میں انسان کی اس ہنرمندی کے لیے تخلیق کا لفظ بھی ہندوستان میں سب سے پہلے اقبال ہی نے استعمال کیا جو اسی مخرج کا مشتق ہے جس کا خلق اور مخلوق، اس طرح کلام اقبال پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ من حیث المجموع اقبال کے یہاں ملاّ کا لفظ بری طرح معتوب ہوا ہے اور برہمن کے لفظ نے حددرجہ احترام پایا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ دو علامتیں اپنے اصل معانی میں الٹ گئی ہیں کہ ملاّ جسے فلاح انسانیت کا ذریعہ ہونا چاہیے تھا معاشرہ کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرا اور برہمن جس سے منفی توقعات وابستہ تھیں، معاشرہ کی ترقی کا ضامن قرار پایا۔ ملاّ ایک طرح سے سوہان روح ہے اور زخم تازہ کرتا ہے جبکہ برہم بعض لحاظ سے قابلِ تقلید ہے۔

کافر بیدار دل پیش صنم
بہ زدیندارے کہ خفت اندر حرم

(گلشن راز جدید ص ۶۲۷)

(زندہ دل کافر جو بت کے سامنے بیدار ہے، اس دیندار سے بہتر ہے جو حرم میں سویا پڑا ہے۔)

ظاہر ہے اقبال نے ممتاز خوبیوں والے ہر شخص کی عزت کی ہے اور اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اقبال کو ہندوستان کی ہر شے سے پیار ہے۔ انھوں نے یہاں کی ہر چیز کی تعریف کی ہے۔ یہاں کے پہاڑ، یہاں کے دریا، یہاں کے شوالے، یہاں کی زبانیں، یہاں کی فکر، یہاں کا فلسفہ حتیٰ کہ یہاں کے ماہ سیما بھی ان کو دنیا میں سب سے انوکھے اور سب سے منفرد نظر آتے ہیں۔ تو نے اے اقبال یورپ میں سے ڈھونڈا عبث بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤں میں تھی۔ غرض کہ اقبال کو ہندوستان کی ہر شے بے حد عزیز ہے۔ اس کا ایک ایک ذرّہ ان کے لیے دیوتا کی مانند ہے۔ لیکن ان سب میں برہمن سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ ہے۔ اقبال ان سب میں زیادہ برہمن کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ کیا دوسری اقوام میں بھی اکابرین اسلام کو ایسی ہی تعظیم سے دیکھا جاتا ہے؟ اور کیا دوسری اقوام اور ان کے پیشواؤں کو اس قدر نظر تکریم سے دیکھنے والے شخص کو کسی عصبیت کی نگاہ سے دیکھنا مناسب ہے؟ یا کیا اقبال کو صرف شاعر اسلام سمجھ لینا کافی ہے؟ اور شاید نہیں کیونکہ فکر اقبال کی بہت سی جہات ہیں اگر زاویے بدل بدل کر دیکھیں تو ہمیں ایک اور ہی نیا اور حیرت زا اقبال نظر آئے گا جو صرف عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگا بلکہ مسائل کا حل پیش کرنے والا بھی ملے گا۔ فی زمانہ اقبال کو اسی طرح دیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اقبال کا مسلک اکرامِ آدم تھا اور انسانیت کا احترام تھا۔ وہ اپنی زبان قلم سے کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ اگر غور کریں تو صحیح معنوں میں اقبال کا مبلغ وہ تھا جسے انھوں نے جاوید نامہ میں ''سخنے بہ نثراد نو کے'' تحت واضح کیا ہے۔

حرف بدرا برلب آور دن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلق خداست
آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

(حرف بدکو زبان پر لانا بھی غلطی ہے۔ کافر اور مومن سب خدا کی مخلوق ہیں۔ آدمیت آدمی کا احترام کرنا ہے۔ اس لیے تو آدمی کے مقام سے آگاہ و باخبر ہو جا۔)

☆☆☆

بچوں میں جذبۂ حبّ الوطنی اور اقبال

ملک اور قوم کی ترقی کا سارا انحصار بچوں کی تربیت پر مبنی ہے۔ کسی نے بچوں کو ''ابوالآدم'' یعنی ''آدمیوں کا باپ'' کہا تھا۔ یہاں یہی رمز پوشیدہ ہے کہ بچے ہی آگے چل کر بزرگ یا بڑے انسان بنتے ہیں۔ چھوٹے ہی بڑے پن کا پیش خیمہ ہیں اس لیے ان کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے کچے ذہنوں میں جس قسم کی تعلیم پیوست کردی جائے گی، ان کا مستقبل اور ان کے معاشرہ کا وجود اسی قسم کا ہوگا۔ اس لیے اقبال کے کلام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بچوں اور ان کے معلموں پر ملک وقوم کی ترقی کا دارامدار رکھتے ہیں۔ اگر بچوں کو شروع ہی سے اپنے وطن اپنے ملک اور اپنی قوم کی اہمیت کا درس نہیں دیا جائے گا تو وہ آئندہ کے قومی اور ملکی شعور سے نابلد رہ جائے گی اور ترقی کے زینے پر چڑھنے کے قابل نہ ہوسکے گی۔ اقبال نے ابتدائی ادبی شعری زندگی میں ایک مضمون ''بچوں کی تعلیم وتربیت'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس مضمون میں بچوں کی نشو ونما کا مدار مدرّس پر ہی رکھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح پودوں کے پھلنے پھولنے اور پرورش پانے کا تمام تر انحصار مالی پر ہوتا ہے۔ استاد بھی تو باغبان کی طرح فصل تیار کرتا ہے۔ اس کی توجہ کے بغیر ملک اور قوم کی ساری کھیتی بنجر رہ سکتی ہے۔ مذکورہ مضمون میں اقبال نے لکھا تھا:

> ''آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا ان ہی کی قدرت میں ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجہ کی محنت اور سب کارگذاریوں سے اعلیٰ درجے کی کارگذاری ملک کے معلموں کی کارگذاری ہے۔ اگرچہ بدقسمتی سے اس ملک میں اس مبارک پیشہ کی وہ قدر نہیں جو قدر ہونی چاہیے تھی۔ معلم کا فرض تمام فرضوں سے زیادہ مشکل اور اہم ہے کیونکہ تمام قسم کے اخلاق تمدنی اور مذہبی نیکیوں کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہے اور تمام قسم کی ملکی ترقی کا سرچشمہ اس کی محنت ہے۔ پس تعلیم پیشہ اصحاب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیشہ کے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے

اپنے طریق تعلیم کو اعلیٰ درجہ کے اصولوں پر قائم کریں۔ اس کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ ان کے دم قدم کی بدولت علم کا سچا عشق پیدا ہو جائے گا جس کی گرمی میں وہ تمدنی اور سیاسی سر سبزی مخفی ہے۔ جس سے قومیں معراج کمال تک پہنچ سکتی ہیں۔''

(اقبال کے نثری افکار، ص ۲۵۔۲۴)

یہاں پر یہ بات خاص طور پر نوٹ کر لینے کی ہے کہ کسی بھی ملک کے معراجِ کمال کا تعلق اس ملک کی اقوام سے ہے۔ قومیں معراجِ کمال تک پہنچیں گی تو گویا ملک ہی معراجِ کمال کو پہنچے گا۔ کمال حاصل کر لینا مٹی اور اینٹ پتھر کا کام نہیں ہے بلکہ اس مٹی اور اینٹ پتھروں کے درمیان رہنے والے انسان کا ہے جسے اپنا فرض اولین سمجھ کر نبھانا از حد ضروری ہے۔ اس خیال سے ایک اور بات کا سراغ بھی ملتا ہے کہ اقبال کی نظر سب سے پہلے بچوں کی تعلیم و ترقی پر پڑی تھی اور ان کی زندگی میں معلمانہ فرائض کے انجام دہی کا فریضہ بھی اقبال کو ادا کرنا تھا اور انھوں نے کیا۔ اپنی تمام تر شاعرانہ زندگی میں بچوں کے لیے جتنی نظمیں انھوں نے بانگِ درا میں لکھی ہیں اتنی کسی اور مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ یہ خیال از اول تا آخر اقبال کے ملحوظ خاطر رہا۔ وہ بچوں کے نرم و نازک دلوں میں وطن عزیز کی محبت کا درد بھرتے رہتے ہیں۔ بانگ درا میں بچوں کی خاطر لکھی گئی نظموں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان سبھی نظموں میں اقبال نے کسی نہ کسی طرح بچوں کے ذہن کو ایک کامیاب اور باوقار انسان بننے کی تعلیم دی ہے۔ اس طرح انھوں نے بچوں کی ترقی میں ملک و ملت کی ترقی کا خواب دیکھا ہے۔ بانگ درا میں جو سب سے پہلی نظم ہمارے سامنے آتی ہے وہ ''ایک مکڑا اور ایک مکھی'' ہے۔ یہ بچوں کو ایک قصہ یا کہانی کی شکل میں سنائی گئی ہے اور اس سے ایک خاص قسم کی ہوشیاری اور بیداری کے درس کا کام لیا گیا ہے اور کسی کے دام فریب میں نہ پھنسنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ مکڑا مکھی سے کہتا ہے کہ آپ تو ہماری اپنی ہیں، پھر ہم سے غیروں کی طرح کا سلوک کیوں کرتی ہیں۔

غیروں سے نہ ملیے تو کوئی بات نہیں ہے
اپنوں سے مگر چاہیے یوں کھنچ نہ رہنا
آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری
وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا

تو مکھی اس مکڑے کی چال کو سمجھ گئی اور پہچان گئی کہ یہ تو دشمن جانی ہے اور جال میں پھانس کر خون

چوسنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ باخبر تھی اور فوراً اس کو جواب دیا ۔

اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا پھر نہیں اترا

یہ جعل سازی اور فریب ملکوں اور قوموں کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک کو غصب کرنا چاہتا ہے تو پہلے وہاں کے باشندوں کو بہلا پھسلا کر دام غلامی میں اسیر کر لیتا ہے۔ اسی طرح مکڑے نے مکھی کی خوشامد کی اور اسے میٹھی میٹھی باتوں میں لگا کر اپنے بُنے ہوئے جال میں پھنسا لیا۔ بالکل یہی حال بعض اقوام کا ہے کہ اپنی عیاری اور مکاری سے دوسرے ملکوں پر قابض ہو جاتے ہیں اور انسانوں کی آبادی کا خون چوس لیتے ہیں۔ اس نظم میں ذرا غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آخر اقبال نے یہ قصہ بچوں کو کیوں سنایا تھا؟ یہ قصہ ان نازک اور معصوم بچوں کو اسی لیے سنایا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے دشمنوں سے ہوشیار ہو جائیں تا کہ اپنے وطن، اپنے ملک کی حفاظت کر سکیں اور دام فریب میں جکڑ کر بزرگوں کی میراث کو نہ گنوا بیٹھیں۔ عیاری اور مکاری کے ساتھ خوشامد جیسی مہلک شے سے خبردار رہنے کا درس بھی اس نظم میں ملتا ہے تا کہ آنے والی زندگی میں کسی کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اپنی جان، اپنا مال اور اپنا وطن اپنے ہاتھوں نہ کھو دیں۔ اس طرح بچوں کے دل میں حبّ الوطنی کا جذبہ بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ خوشامد یعنی انکساری اور عاجزی سے اپنے کام نکالنے اور پیار محبت سے زندگی گذارنے کا سبق بھی ہے جو ایک طاقتور ملک کے لیے نہایت ضروری ہے۔ پیار محبت اور اخوت و بھائی چارہ کسی بھی ملک کی پائیداری اور بقا کا ضامن ہے۔ اس طرح وطن کے تحفظ کے لیے یہ دونوں باتیں اقبال نے بچوں کے گوش گذار کر دیں۔

''ایک مکڑا اور مکھی'' کے ساتھ بانگ درا میں ایک اور نظم ہے جس کا عنوان ''ایک گائے اور بکری'' ہے۔ اقبال بچوں کو چھوٹی چھوٹی کہانیاں سنا کر ہدایت کر رہے ہیں اور دیکھیے معصوم ذہنوں کو کس طرح جذبۂ حب الوطنی سے سرشار کر رہے ہیں۔ ''ایک گائے اور بکری'' ایک مکالماتی نظم ہے۔ جس مین ایک بکری کہیں چرتی چراتی ندی کے پاس پہنچ گئی اور اس نے وہیں ایک گائے کو بھی چرتے ہوئے دیکھا۔ جب اس نے گائے سے اس کا حال پوچھا تو گائے نے انسان کے مظالم کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ اگر میں کم دودھ دیتی ہوں تو وہ مجھے بُرا بھلا کہتا ہے اور جب دُبلی ہو جاتی ہوں تو مجھے بیچ کر کھا جاتا ہے۔ جبکہ اس انسان پر میرے بڑے احسانات ہیں۔ اس کے

بچوں کو دودھ پلاتی ہوں، جس سے وہ تندرست وتوانا ہوتے ہیں۔ بکری نے جب یہ بات سنی تو بولی کہ شکوہ شکایت کرنا اچھا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تمام نعمتیں جو ہمیں میسر ہیں آدمی ہی کے دم سے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چراگاہ اور یہ ہری ہری گھاس سب اس انسان کے ذریعے نصیب ہیں۔ اب ذرا سوچو کہ بَن کے اندر کس قدر خطرات ہیں لیکن اس کی موجودگی سے ہی ہمارے لیے تمام خطرے ٹل گئے ہیں ہمیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔ تو گائے کی سمجھ میں اس کی کچھ بات آگئی اور اس نے آخر میں یہ بات کہی۔

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

اس نظم میں بظاہر حب الوطنی کا شائبہ نظر نہیں آتا لیکن ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں بھی وطن عزیز کی بے جا محبت اور اس کی خیر سگالی کی فکر پوشیدہ ہے۔ گائے اور بکری کی گفتگو کا اختلاف ہی آپسی انتشار اور عناد کا بیج ہے۔ اقبال اس اختلاف اور فرقہ آرائی کے مخالف ہیں جس کی لے اقبال کی اواخر عمر کی نظموں میں نمایاں ہے۔ لیکن ان دونوں فریقوں یا فرقوں میں اتفاق پیدا ہونا ہی ملک ووطن کے لیے بہتری کا ضامن ہے۔ اگر چراگاہ کو وطن اور بکری اور گائے کو عوام تصور کریں تو آدمی کا مرتبہ حکمرانی کا درجہ رکھتا ہے۔ گائے اور بکری یعنی عوام اپنے آقا اور اپنے حکمراں کی وفاداری کریں، ان کی عزت اور عظمت کو سمجھیں اور قدر کریں تو ملک ووطن بڑی حد تک اس تفرقہ پرداری یعنی فرقہ آرائی کے تعصب سے پاک ہو جائے گا جو ملک کی ترقی کے لیے باعثِ برکت ہوگا۔

اس نظم کے بعد بانگ درا میں اقبال کی وہ شہرۂ آفاق نظم ہے جسے ''بچے کی دعا'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بچوں کے ادب میں یہ نظم درسِ حب الوطنی کی سب سے عمدہ مثال ہے۔ اگرچہ یہ نظم Child's Harold کا انگریزی سے ترجمہ ہے لیکن وطن کے لیے نیک خواہشات اور تمناؤں کا ایک خوبصورت تحفہ ہے۔ بچے جب دعا میں کہتے ہیں۔

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو میرے دم سے یوں ہی میرے وطن سے زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

اور

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ بُرائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

تو ملک و وطن کی تنظیم نو یعنی قابلِ تعریف نظم ونسق کا پیام دیتے ہیں جن بچوں کے دل میں وطن کی خدمت اور اس کے باشندوں کی خدمت کا جذبہ ہوگا تو یقیناً اور لامحالہ وہ ملک اور وہ وطن ترقی یافتہ ہوگا۔ وہاں امن چین کا پیغام ہوگا۔ اچھائیوں کا اور خیر و برکت کا دور دورہ ہوگا۔ بچوں کی یہ تمنائیں اقبال کی بھی تمنائیں ہیں۔ جو انسانوں کے ذریعے خدا کی اس سرزمین کو سجانے سنوارنے کی آرزو کو ظاہر کرتے ہیں)۔ اس خواہش کا تذکرہ آئندہ صفحات میں ملے گا۔ اقبال کے کلام میں اس دور کی نظموں میں آپسی میل محبت اور ایک دوسرے کے لیے مر مٹنے کا جذبہ بڑی شدت سے کارفرما نظر آتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی ان نظموں میں نا اتفاقی اور آپسی اختلافات سے خبردار کرنے کی اپیل ہے۔ وطن عزیز میں رہ کر ایک دوسرے کے کام آنا اور ایک کی مجبوری کو دوسرے کے ذریعے دور کرنے کی تمنائیں پائی جاتی ہیں۔ یہ بھی حب الوطنی کی ایک شکل ہے جس کے بغیر وطن تباہی و بربادی کا شکار بن سکتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ نظم کے بعد بانگ درا میں ایک نظم ''ہمدردی'' کے عنوان سے ملتی ہے۔ اس نظم میں جگنو اور بلبل کی گفتگو ہے۔ بلبل اندھیرے سے پریشان ہے تو جگنو جس کو قدرت نے مشعل دی ہے اس کو روشنی دکھا کر اس کے گھونسلے تک پہنچاتا ہے۔ یعنی اس کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتا ہے۔ عزیزان وطن اگر اپنی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ اس طرح کریں کہ اپنی ایک چیز دوسرے کے لیے نثار کر دیں تو معاشرہ ایک نہایت ممتاز اور مثالی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

اس نظم کے بعد جو نظم آتی ہے وہ تو گویا غلامی کی حکومت کے خلاف ایک احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظم کا عنوان ہے ''پرندے کی فریاد'' جو پنجرے میں قید ہے۔ روتا ہے، چلاتا ہے تو سننے والے اسے گانا سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کو اپنی آزادی، اپنا وطن، اپنا آشیانہ، اپنی مرضی سے آنا جانا، چلنا پھرنا، اڑنا اور پھدکنا سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ یہ پرندہ جو پنجرے میں بند ہے، غلامی کی علامت بن گیا۔ اگر اس پرندے کو ہندوستان تسلیم کریں اور پنجرے کو انگریزی حکومت تسلیم کریں تو یہ نظم ''ترانۂ آزادی'' ہے جو بچوں کو بے حد پیار کے ساتھ سمجھائی گئی ہے۔ ان کے دل میں غلامی کی مجبوریوں کا تصور بڑی اچھی طرح بٹھایا گیا ہے۔ غلامی کی صعوبتیں، پریشانیاں اور مصیبتیں جن میں

دل بجھ جاتا ہے سب بیان کی گئی ہیں۔

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں
جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

یہ بے بسی اور بے کسی کا عالم ہے بچوں کے دل پر ضرور اثر کرے گا اور پھر آخر میں فریاد بھی ہے اپنے آقاؤں سے آزادی کی سوغات بھی طلب کی گئی ہے۔

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

کیا یہ بچوں کے لیے حب الوطنی کی عمدہ مثال نہیں ہے؟ کیا اس نظم سے بچوں کے دل میں آزادی کا جوش پیدا نہیں ہوگا؟ کیا وہ اس غلامی کی زنجیر کو توڑنے کا خواب نہیں دیکھیں گے؟ اگر ہاں تو یہ نظم جذبۂ حب الوطنی کو بیدار کرنے والی ایک بہت ہی اچھی نظم ہے۔ اس سے اقبال بچوں میں محبت وطن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بچوں کے لیے ''پرندے کی فریاد'' جیسی معرکتہ آلآرا نظم کے بعد بانگ درا میں ایک نظم ''جگنو'' ہے۔ اقبال نے اس نظم میں جگنو کو موضوع سخن بنایا ہے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ علم نفسیات کی رو سے کم عمر بچے تیز آواز، تیز چال اور تیز روشنی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اقبال نے اس نظم میں جگنو کا انتخاب کر کے گویا بچوں کی نفسیات Phychology کو ملحوظ نظر رکھا ہے۔ روزانہ زندگی کے تجربات میں اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا ہے بچے جگنو کی چمک سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی روشنی کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے جگنو کو پکڑ کر باریک کپڑے میں رکھ لیتے ہیں اور اس کی چمک سے کھیلتے کودتے اور محظوظ ہوتے ہیں۔ یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ اگر بچوں کو ان کی پسندیدہ کوئی اچھی بات بتائی جائے یا کوئی مفید حیات گُر سکھایا جائے تو وہ اس کو بہت جلد قبول کرتے ہیں۔ اقبال کے یہاں جگنو تو خود ہی موضوع بحث ہے اور فلسفیانہ مسائل کا محور ہے۔ یہ نظم لفظی اور معنوی اعتبار سے اسی لیے بچوں کے معیار سے بالاتر ہے لیکن فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نظم کا موضوع بچوں کے لیے خاص طور پر منتخب کیا گیا ہے۔ اس نظم میں تین بند ہیں۔ پہلے بند میں پروانہ کی خوبیاں متعدد تشبیہات و استعارات کے ذریعے بیان کی گئی ہیں۔ اس کو کئی بار

چاند اور اس کے متعلقات سے تشبیہ دی گئی ہے اور ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ بچوں کے کھیل میں چاند بھی ایک اہم کھلونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ جگنو کو دوسرے کیڑوں سے ممتاز قرار دیا گیا ہے۔ وہ اس لیے کہ دوسرے کیڑے مثلاً پروانہ وغیرہ روشنی کے طلب گار ہیں جبکہ جگنو خود ہی سراپا نور ہے۔ اس طرح یہاں پر اقبال کے فلسفۂ خودی کی جھلک بھی نظر آتی ہے جس کے مطابق بچوں کو خود کفیل بننے کی تعلیم دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جس کے پاس اپنی روشنی ہے وہ دوسروں سے روشنی مانگنے والوں سے بہتر ہے۔ لہٰذا تم لوگ بھی اپنے اندر خوبیوں اور صلاحیتوں کا نور یا روشنی پیدا کرو اور دوسروں کے دست نگر بن کر نہ رہو۔

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا

دوسرے بند میں اقبال نے دنیا کی مختلف چیزوں کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ قدرت نے ہر چیز کو کچھ نہ کچھ صفت عطا کی ہے اور سب ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ لیکن اس جداگانہ طرز حیات میں صرف سمجھ کا فرق ہے ورنہ اشیاء کی حقیقت ایک ہی ہے۔

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

اس نظم کا آخری بند ہی نظم کا عروج اور اس کا خلاصہ ہے جس میں شاعر کا پیغام ملتا ہے کہ اصل میں ہر شے ازلی حسن کا مظہر ہے۔ جتنی بھی چیزیں، جتنے بھی لوگ اور جتنے مظاہر جدا جدا نظر آتے ہیں وہ سب کسی ایک ہی شے کا پتہ دیتے ہیں۔ اگر غور کریں تو اختلافات سارے کے سارے کسی ایک وحدت یا کسی ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ سب ہمارے سوچنے اور خیال کرنے کا فرق ہے۔

انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہے
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہے

یعنی اس نظم کا موضوع بھی ''اتحاد و اتفاق'' ہی ہے اور یہی اقبال کا اس عہد کا خاص پیغام ہے۔ بچوں کے ذہن ابتدائے حیات ہی سے ''اتحاد و اتفاق'' کا تصور سما جائے گا تو بڑے ہو کر بھی وہ اسی راہ پر گامزن رہیں گے اور معاشرہ میں امن و امان کے ضامن بنیں گے، جس سے قوم اور ملک دونوں کو صحیح سمت اور صحیح رفتار کے ساتھ ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔ یہ اقبال کا طباع ذہن ہی ہے کہ کہاں جگنو اور کہاں قومی یگانگت اور قومی ہم آہنگی کا پیام۔ یعنی اقبال نے ننھی اور معمولی معمولی چیزوں کو بھی ملک و وطن کی خدمت کا ذریعہ بنالیا ہے۔

اس نظم کے ساتھ جو نظم ہے وہ تو گویا بچوں کے لیے حب الوطنی کا ترانہ ہے۔ اس نظم میں اقبال نے وطن ہی کا راگ گایا ہے اور بتایا ہے کہ ہندوستان وہ جگہ ہے جہاں چشتی، نانک، تاتاری، حجازی، یونانی، فارسی اور انبیاء کا مرکز توجہ ہے۔ میر عرب نے جس جگہ سے ٹھنڈی ہوا محسوس کی، بندے کلیم کی مانند ہیں اور حضرت نوحؑ کا سفینہ جہاں آکر ٹھہرا یعنی یہ ملک مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے اور یہ ہندوستان ہی ہے یہ میرا وطن ہی ہے۔ اس جیسا کوئی دوسرا ملک نہیں ہے۔ اس نظم میں جو ایک مخمس کی شکل میں لکھی گئی ہے، یہ مصرع بار بار دہرایا گیا ہے ؎

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اور یہ باور کرانے کی سعی کی گئی ہے ہمارا ملک ایک ایسا ملک ہے جو الگ الگ قسم کی خوبیوں کا مرقع ہے۔ اس میں طرح طرح کے عقائد اور رسومات پائے جاتے ہیں اور اس جداگانہ رنگ اور کثرت ادیان کے باوجود ان سب میں ایک یگانگت ہے اور یہی اس ملک کی خوبی اور خصوصیت ہے یہ عجیب اور غریب ملک، ایسا دلکش اور مختلف الالوان خطہ ارضی ہے کہ سب کی کشش کا باعث ہے اور یہ میرا وطن ہے۔ میں ایسے ہی خوش نما ملک کا باشندہ ہوں۔ مجھے اپنے اس ملک ہندوستان پر فخر ہے۔ اس نظم میں اقبال نے اپنے وطن عزیز کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا ہے کہ اس کی نعمتوں، راحتوں کو جنت کی نعمتوں سے تعبیر کیا ہے۔ اس ملک کے راحت و آرام گویا جنت کے راحت و آرام کے مانند ہیں۔

رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا جنت کی زندگی ہے جس کی فضا کا جینا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

وطن کے بارے میں اس طرح کے خیالات کا اظہار کرنا اقبال کی کمال حب الوطنی کی دلیل ہے جسے وہ اپنے ہی ہم وطن بچوں میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔

بانگ درا کی ایک آخری نظم جو بچوں کے لیے مفید مطلب ہے ''ایک پرندہ اور جگنو''

ہے۔اس نظم میں بھی اقبال نے پرندے اور جگنو کے ذریعے اخوت ومحبت کا پیغام دیا ہے اور بتایا ہے کہ اتفاق ومحبت ہی کی وجہ سے اس دنیا کی رونق باقی ہے۔اگر یہ پیار اور محبت جاتا رہے گا تو اس دنیا کی محفل کی رونق بھی ختم ہو جائے گی۔اس نظم میں ایک افسانوی انداز اپنایا گیا ہے اور بچوں کو کہانی یا واقعہ سنا کر آپسی میل مروت کی ترغیب دی گئی ہے۔اس کا قصہ بیان کرنے کے بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے۔یہاں یہ چھوٹی سی نظم نقل کر ہی دی جائے ؎

سر شام اک مرغ نغمہ پیرا
کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا
چمکتی چیز . اک دیکھی زمیں پر
اڑا طائر اسے جگنو سمجھ کر
کہا جگنو نے او مرغ نوا ریز
نہ کر بے کس پہ منقار ہوس تیز
تجھے جس نے چہک گل کو مہک دی
اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی
لباس نور میں مستور ہوں میں
پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں
چمک تیری بہشتِ گوش اگر ہے
چمک میری بھی فردوسِ نظر ہے
پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی
تجھے اس نے صدائے دلربا دی
تری منقار کو گانا سکھایا
مجھے گلزار کی مشعل بنایا
چمک بخشی مجھے آواز تجھ کو
دیا ہے سوز مجھ کو ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز
جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز

قیام بزم ہستی ہے انھیں سے
ظہور اوج و پستی ہے انھیں سے
ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستان کی

آخری دو شعر اس پوری نظم کا نچوڑ اور خلاصہ ہیں اور انھیں دونوں شعروں میں نفسِ مطلب کو پیش کیا گیا ہے۔

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

اس طرح بانگ درا میں بچوں کے لیے لکھی گئی کل نظمیں دس ہیں۔ ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، بچے کی دعا، ہمدردی، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد، جگنو، ہندوستان بچوں کا قومی گیت، ایک پرندہ اور جگنو۔ اگرچہ ان تمام نظموں کا الگ الگ اور مفصل تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے جس کا فی الحال یہاں محل نہیں ہے لیکن اس مختصر سے مضمون میں یہ بات ضرور عرض کر دینے کی ہے کہ ان سب نظموں میں زیادہ تر نظمیں ایسی ہیں جن میں فرقہ پرستی اور آپسی بغض و عناد کے خلاف ارشاد فرمایا گیا ہے اور آپسی میل ملاپ کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ زمانہ اقبال کی ابتدائی شاعری کا زمانہ ہے اور بانگ درا میں یہ نظمیں ان کے ۱۹۰۵ء تک کے کلام میں ملتی ہیں۔ یہ بات بھی ساری دنیا جانتی ہے کہ ۱۹۰۵ء تک کا زمانہ اقبال کی شاعری کا وہ زمانہ کہلاتا ہے جس میں ان کا رجحان حب اوطنی کی طرف زیادہ تھا۔ وطن پرستی اور وطن پروری کا سب سے اچھا اور سب سے عمدہ طریقہ بھی یہی تھا کہ برادران وطن کو قوم کے نونہالوں کو پیار اور محبت کا درس دیا جائے کیونکہ اقبال جگہ جگہ اس بات کا تذکرہ کرتے آئے ہیں کہ قوم و وطن کی بربادی کا سب سے بڑا ذریعہ آپسی انتشار ہے۔ آپسی ناچاتی اور نا اتفاقی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام افراد قوم متحد و متفق ہو کر رہیں جس کے لیے ضروری ہے کہ آنے والی نسلوں کو پیار و محبت اور جاں نثاری کی تعلیم دی جائے جس سے اہل وطن آنے والے وقت میں مضبوط رسّی سے بندھے رہیں اور باہم دگر ٹوٹنے نہ پائیں۔ حب الوطنی اور وطن پرستی کی یہ ایک کیا ہی اچھی مثال ہے۔ جس کا خیال اقبال کے ذہن میں آیا اور یہی خیال پھر مستقبل میں اس طرح صحیح ثابت ہوا کہ آپسی جھگڑوں اور باہمی اختلافات نے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اگر ہندوستانی باشندے اقبال کی تجویز اور تعلیم پر عمل کر لیتے تو آج سالم ہندوستان شاید ایشیاء کا سب سے طاقتور ملک ہوتا۔

بانگ درا کے حصہ اول کی ان مختصر نظموں کے علاوہ باقیات اقبال میں بھی بچوں کے لیے نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں میں تعلیم، علم، طاقت اور نمونہ کا کردار زیادہ تر ملحوظ خاطر رہے ہیں۔ بانگ درا والی نظموں میں بھی اتحاد و اتفاق کی تعلیم کے علاوہ احترام انسان، احترام مذاہب، بزرگوں کی عزت، حاکم وقت یا برسر اقتدار اصحاب کی فرماں برداری، چھوٹوں کی دل جوئی اور ان کے ساتھ رحم دلی کا سلوک، بزرگوں کی میراث اور وطن کی دولت کو سنبھال کر رکھنا، مکر کی چالوں سے ہوشیار رہنا اور ہر برائی سے بچنا اور خدا کی پناہ چاہنا وغیرہ کئی اہم خیالات کی تعلیم و ترغیب ہے جو ملک کی سالمیت اور ترقی کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ ملک کے باشندوں میں جب یہ تمام صفات پیدا ہوں گی تو وطن خود بخود راہ ترقی پر گامزن ہوگا۔ انھیں تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ بھی ہے کہ کوئی خواہ کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو لیکن اپنے سے چھوٹے کو کمتر نہ سمجھے یعنی سب کو برابر جانے۔ مساوات کی یہ تعلیم ''ایک پہاڑ اور گلہری'' میں بڑے ہی خوبصورت انداز سے دی گئی ہے۔ اگر انسان ایک دوسرے کو برابر سمجھے تو جھگڑے اور فساد کا امکان بہت کم ہے۔ اوراق گذشتہ میں اس نظم کا تذکرہ کا طرخواہ نہ ہوسکا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی جادو کا وہ منتر ہے جس سے فتنہ و فساد کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ کوئی کسی کی ہم سری نہ کرے، کسی کو ذلیل اور خوار نہ جانے، اپنے سے کمتر اور بدتر تصور نہ کرے تو دشمنی اور عناد کا شجر آسانی سے نہ پنپ سکے گا۔ پہاڑ جب گلہری سے کہتا ہے کہ میری شان کے آگے تیری کیا بساط ہے۔ جو بات مجھ میں ہے وہ تجھے نصیب کہاں ہے۔ تو گلہری اسے بہت ہی عمدہ اور معقول جواب دیتی ہے اور دلائل سے صحیح ثابت کر دیتی ہے۔ بہت سی ایسی خوبیاں پہاڑ میں نہیں ہیں جو گلہری میں موجود ہیں۔ گلہری کا استدلال ملاحظہ کریں۔ گلہری پہاڑ سے کہتی ہے۔

جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا کوئی چھوٹا یہ اس کی حکمت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے
قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے خوبی ہے اور کیا تجھ میں

جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو
نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بڑا نہیں قدرت کے کارخانے میں

گلہری نے اپنے طرز استدلال سے پہاڑ کو قائل معقول کیا لیکن آخری شعر پر غور کیجیے کہ شاعر کا خیال ہے کہ دنیا میں کوئی چیز نکمی نہیں اور قدرت کے کارخانے میں کوئی مغرور و متکبر بڑا اور بالا نہیں ہوتا ہے۔ اصل میں وہ پیغام جس کی ہمارے معاشرے اور ہمارے ملک کو ضرورت تھی اور اب بھی ہے، تمام انسانوں میں کسی بھی انسان کو نکما نہ سمجھا جائے اور کوئی کتنا بھی باثر باثروت اور قوی کیوں نہ ہو، لیکن اگر وہ غرور و استکبار سے پاک ہے تو چھوٹوں کا دل ضرور جیتے گا۔ غریبوں اور ناداروں کی ہمدردی ضروری حاصل کرے گا۔ اس طرح ایک عجیب و غریب معاونت اور مساوات کا ماحول پیدا ہوگا۔ یہ خیال بچوں کے دل میں جاگزیں ہوگا تو وہ مستقبل قریب میں اس نمونے کا مظہر بن جائیں گے۔ یہ نظر اور یہ فکر اس لیے بچوں کے دلوں میں ڈالی گئی ہے کہ وہ وطن عزیز کی عظمت کو برقرار رکھ سکیں۔ اس کے لیے جی توڑ محنت کریں اور جی جان سے اس کے لیے فدا ہونے کو تیار رہیں۔ تبھی ایک متحدہ معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکے گی۔

اگر بچوں کے ذہن میں وطن کی محبت اور اخوت و بھائی چارے کی تعلیم جاگزیں ہوگی تو ملک و وطن کی سالمیت کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ اس کے لیے شروع ہی سے بچوں کے ذہن کی تربیت ضروری ہوگی۔ اگر وہ زندگی میں دوسروں کی خاطر جینا سیکھ لیں تو خود اپنی زندگی کو شاندار بنا سکیں گے۔ اور ہر فرد کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ذاتی تعصبات سے بَری ہو تو دوسروں کے لیے بھی مشعل راہ بن سکے گا اور دنیا کے لیے نمونہ بن سکے گا اور ملک اور تمام دنیا کے لیے فخر کا باعث ہو سکے گا۔ اقبال نے اپنے اسی مضمون میں جس کا تذکرہ ہم شروع میں کر آئے ہیں، واضح طور پر لکھا ہے کہ

''سچ پوچھیے تو تمام قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے۔ اگر طریق تعلیم علمی اصولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے ہی عرصے میں تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں اور دنیوی زندگی ایک ایسا دلفریب نظارہ معلوم ہو کہ اس کے ظاہری حسن کو مطعون کرنے والے فلسفی بھی اس کی خوبیوں کے ثناخواں بن جائیں۔ انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ دنیا کے لیے اس کا وجود زینت کا باعث ہو اور جیسا کہ

ایک یونانی شاعر کہتا ہے اس کے ہر فعل میں ایک قسم کی روشنی ہو جس کی کرنیں اوروں پر پڑ کر ان کو دیانت داری اور صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سبق دیویں۔ اس کی ہمدردی کا دائرہ دن بہ دن وسیع ہونا چاہیے تاکہ اس کے قلب میں وہ وسعت پیدا ہو جو روح کے آئینہ سے تعصبات اور توہمات کے رنگ کو دور کر کے اسے مجلیٰ و مصفیٰ کر دیتی ہے۔ صدہا انسان ایسے ہیں جو دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر اپنے اخلاقی تعلقات سے محض جاہل ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی بہائم کی زندگی ہے کیونکہ ان کا ہر فعل خود غرضی اور بے جا خودداری کے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کے تاثرات کا دائرہ زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان، اپنے افراد تک محدود ہوتا ہے اور وہ اس مبارک تعلق سے غافل ہوتے ہیں جو بحیثیت انسان ہونے کے ان کو باقی افراد بنی نوع سے ہے۔ حقیقی انسانیت یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض سے پوری پوری آگاہی ہو اور وہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان درخت کی ایک شاخ محسوس کرے جس کی جڑ تو زمین میں ہے مگر اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں۔ اس قسم کا کامل انسان بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر انسانی بچے کی تربیت میں یہ غرض ملحوظ رکھی جاوے کیونکہ یہ کمال اخلاق تعلیم و تربیت ہی کی وساطت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جو لوگ بچوں کی تعلیم و تربیت کے صحیح اور علمی اصول کو مدنظر نہیں رکھتے وہ اپنی نادانی سے سوسائٹی کے حقوق پر ایک ظالمانہ دست درازی کرتے ہیں جس کا نتیجہ تمام افراد اور سوسائٹی کے لیے انتہا درجہ کا مضر ہوتا ہے۔''

(اقبال نثری افکار، ص ۱۸۔۱۷)

یہ اقبال کے بالکل ابتدائی افکار ہیں جن میں وسعت اور بے کرانی کا یہ عالم ہے کہ وہ زمین کے کسی مخصوص حصے کو مرکز التفات نہیں بنا رہے ہیں بلکہ ان کے پیش نظر وطن کا جامع تصور ہے اور زمینی ٹکڑے کے بجائے سوسائٹی کا لفظ استعمال کر رہے ہیں جو تمام کرۂ ارض کو محیط ہے اور ایسا عظیم محبّ وطن انسان پیدا کرنا چاہتے ہیں جو محبّ عالم ہے بلکہ محبّ کائنات ہے۔ جس کی جڑیں تو زمین کو چھو رہی ہیں لیکن اس کی شاخیں دامانِ آسمان سے ملی ہوئی ہیں یعنی وہ اپنی سرشت میں ارضی بھی ہے اور سماوی بھی۔ وطن عزیز سے جو تعلق خاطر ہے وہ آسمان کی بلندیوں کے ہم رکاب ہے۔

یعنی وطن عزیز کی خدمت کو جزو ایمان بنایا ہے اور یہی وہ خیال ہے جو اقبال کی بانگِ درا کی ۱۹۰۵ء والی شاعری کے بعد بھی موضوع بحث بنا تھا، جس کے لیے اقبال کے کلام سے، بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی اقبال کی نظموں میں وطنِ عزیز سے محبت کے ساتھ ساتھ آزادی وطن کا تاثر بھی ابھرتا ہے۔ ان نظموں میں خاص طور پر ''مکھی اور مکڑا''، ''پہاڑ اور گلہری'' اور ''پرندے کی فریاد'' کو ذرا غور سے پڑھیں تو آزادانہ زندگی کے گذارنے کا درس بھی ملتا ہے۔ مکھی، مکڑے کے دام فریب سے آزاد رہنا چاہتی ہے۔ گلہری پہاڑ کے رعب وجلال سے آزادی طلب کررہی ہے۔ بکری جنگل کے درندوں سے نجات کی آرزومند ہے اور ان کی ظالمانہ غلامی کو برداشت نہیں کرنا چاہتی ہے۔ پرندے کی فریاد تو پنجرے سے آزادی کی براہ راست خواہش ہے جو غلامی کی زندگی سے برأت کا طلب گار ہے۔ اس طرح ان نظموں میں حریت وطن، حریت فکر اور حریت حیات کا تصور نمایاں ہے۔ یعنی ندرتِ فکر وعمل کا جذبہ کارفرما ہے۔ جو آگے چل کر اقبال کی شاعری کا ایک خاص جز و یا عنصر قرار پایا۔ آزادی کے اس تصور کا تذکرہ اقبال نے خضرِ راہ میں اس طرح کیا تھا کہ زندگی غلامی کی حالت میں بہت کمزور اور محدود ہو جاتی ہے، جبکہ بحالتِ آزادی اپنی حدیں توڑ کر وہ اتھاہ سمندر کے مانند لامحدود ہو جاتی ہے۔ ملک وملت اور سلطنت سب کچھ آزادی میں ہی فروغ پاتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ حالتِ محکومی میں حکمراں اپنے غلاموں کو بیدار نہیں ہونے دیتے ہیں اور اگر ان میں کسی طرح کی بیداری اور ہوشیاری پیدا ہوتی ہے تو حکمراں طبقہ ان کو کسی نہ کسی طرح کی خواب آور دوا کی سی تسلی دے کر سلا دیتا ہے۔ لیکن جب اس غلامی کے خلاف محکوم قوموں کا خون جوش مارتا ہے تو کوئی نہ کوئی موسیٰ شاعری کے جادو کو توڑ دیتا ہے۔ اس لیے اے میرے ہم وطنو! تم غلامی اختیار کر کے قدرت کی بخشی ہوئی آزاد فطرت کی تذلیل مت کرو۔ اس نظم میں اقبال صاف صاف مغرب کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اہل مغرب کا جو جمہوری نظام ہے اس میں بھی بہانہ بازی ہے اور اس جمہوریت کے پردے میں وہی پرانا قیصری نظام Imperialism یا شہنشاہیت پوشیدہ ہے جو آزادی اور جمہویت کا خواب تمھیں دکھایا جارہا ہے اس کے پردہ میں ظلم وستم کے دیو کا کچلنے والا بھاری پیر ہے۔ قانون سازی مجلسیں، حقوقِ انسانی کی بیٹھکیں اور اصلاح ورعایات کے لیے میٹنگیں منعقد کرنا ایسی شوگر کوٹیڈ Sugar Coated گولیوں کی طرح ہیں جو کھانے میں میٹھی میٹھی ہوتی ہیں لیکن ان کا اثر گہری نیند میں سُلا دینے والا ہوتا ہے۔ خضرراہ کے جس حصے میں یہ خیالات ظاہر کیے گئے ہیں اس کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ

ہوں ۔

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ انّ الملوک | سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر | پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز | دیکھی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں | تو ڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسم سامری
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے | حکمراں ہے اک وہی ساقی بتانِ آذری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن | تاتراشی خواجۂ از برہمن کافر تری
ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظم | جس کے پیروں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھتا ہے تو

دیکھ لیا آپ نے کہ اقبال نے مغربی قوانین اور ان کی بخشی ہوئی جمہوریت کو قفس یعنی ذہنی غلامی ہی کہا ہے۔ آخری شعر میں بتا دیا کہ یہ اک سراب ہے، دھوکہ ہے جسے تم گلستاں سمجھ رہے ہو اور اگر تم پنجرے کو آشیانہ سمجھ رہے ہو، فاش غلطی کر رہے ہو۔ آزادی کے تصور کا یہ عکس ہمیں بالِ جبریل کی نظم ''جاوید کے نام'' میں بھی نظر آتا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے اپنے بیٹے کو جو اس وقت دس بارہ سال کے ہی ہوں گے، پیغام دیا ہے کہ دوسروں کے سہارے کی زندگی سے پرہیز کرو اور اپنا کام حتیٰ کہ اپنا زمانہ بھی خود پیدا کرو اور مغرب کی چمک دمک سے مرعوب ہونے کے بجائے ہندستان کی اشیاء کی قدر کرو۔ یہ نظم بھی غلامی سے نجات اور آزادی کے علم کی بہت نفیس مثال ہے۔ بچے کو یعنی اپنے بیٹے کو صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ امیری اور دولت مندی کے بجائے غریبی اور سادگی میں نام پیدا کرو۔ اس لیے یورپ کی تب وتاب کے بجائے اپنے وطن کی مضبوطی اور پائیداری پر بھروسہ کرو۔ ایسا لگتا ہے کہ اقبال عدم تعاون یعنی Non Cooprative Movement کی تائید کر رہے ہیں۔ نظم ملاحظہ کریں ۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر | نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو | سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں | سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر | مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے!
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

یہ وہی آزادی ہے جو بچوں کو بانگ درا کی ابتدائی شاعری میں دی گئی تھی۔ آزادی اور حفاظتِ وطن کی ایک بہت ہی عمدہ نظم ''خوش حال خاں کی وصیت'' ہے۔ خوش خال خاں خٹک افغانستان کا باشندہ تھا۔ اقبال نے لکھا ہے کہ وہ بے حد ''وطن دوست شاعر تھا۔ اس نے افغانستان کو مغلوں سے آزاد کرانے کے لیے سرحد کے افغانی قبائل کی ایک جمعیت قائم کی۔ قبائل میں صرف آفریدیوں نے آخری دم تک اس کا ساتھ دیا۔ اس کی قریباً ایک سو نظموں کا انگریزی ترجمہ ۱۸۶۲ء میں لندن میں شائع ہوا تھا۔'' اس نظم میں آزادی وطن کے معاملہ میں کسی عقیدہ اور مذہب وملت کی قید نہیں ہے۔ خوش حال خاں خٹک اور مغل دونوں ایک ہی مذہب کے پیرو ہیں لیکن خوش حال خاں اپنے وطن پر مغلوں کا تسلط گوارا نہیں کرتا بلکہ مرنے کے بعد بھی یہ وصیت کرتا ہے کہ میرا مدفن ایسی جگہ پر بنانا کہ جہاں مغل افواج کے گھوڑوں کی گرد بھی اڑ کر نہ آسکے۔ چنانچہ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ خوش حال خاں خٹک کو دُور پہاڑوں میں لے جا کر ایسی جگہ دفن کیا گیا جہاں مغل شہسوار نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بال جبریل کی یہ نظم پڑھے بغیر اصل لطیفِ کلام سے محظوظ نہیں ہوا جا سکتا۔ چنانچہ ذیل میں ہو نظم نقل کی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

قبائل ہو ملّت کی وحدت میں گم — کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے — ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کم تر نہیں — قہستاں کا یہ بچۂ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات — وہ مدفن ہے خوش حال خاں کو پسند

اُڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مغل شہسواروں کی گرد سمند

عام حریت کا یہ وہی جذبہ ہے جو اقبال نے بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے ابتدائی دور میں دیا تھا اور جو پرورش پا کر خوش حال خاں خٹک کی زبان سے ادا ہوا ہے۔

☆☆☆

ہمارا دیس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔ ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں ۔ سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا ۔ وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں ۔ گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو ۔ اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ۔ ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے ۔ اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری ۔ صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں

معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

۱۰؍ اگست ۱۹۰۴ء

اقبال



ڈی-۲۴، ابوالفضل انکلیو، پارٹ I، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵